قطراتِ شبنم
از
گوردھن داس بی اے
لاہور
تیج رام اینڈ سنز
قیمت

والدِ محترم کے نام

گوردھن

عنوانات

فہرست عنوانات

مقدمہ
از
افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی

مُقدّمہ

(از افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی مدظلہٗ)

زمانے کو ضرورت ہے یقیناً سعیِ پیہم کی
اگر کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا؟

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ بیمار کی رائے بھی [illegible]ڑی ہی سی ہوتی ہے۔ مگر آغا مسرور صاحب کی خواہش ہے [illegible] بابو گوردھن داس صاحب بی۔ اے کی ایک دبی کوشش یعنی "قطراتِ شبنم" پر چلتے چلاتے کچھ اپنی رائے بھی دے جاؤں۔

ان صفحوں میں بابو صاحب نے مختلف عنوان پر نثر اُردو کو لآلی محزونہ سے سجایا ہے۔ دراصل لکھنے والے کی جوانی کیطرح اس کی شاعرانہ طبیعت بھی جوان نظر آ رہی ہے۔ بیشک "قطراتِ شبنم" کے مصنف آجکل کے اُن نوجوانوں میں مایۂ ناز ہیں جن سے دنیا بنتی ہے۔

اور چمکتی ہے اور جن کو آگے چل کر شاید یہ بھی کہنا پڑے کہ ع

پارہ خواہد شُد ازیں دست گریبانے چند

مگر یہ خدا کی دین ہے اس میں کسی کا اجارہ نہیں ع

از باغ لالہ روئید و از بُوم زار خس

آپ نے اپنے چھوٹے چھوٹے بے تکلّف فقروں میں روحِ ادب اور ادا شناسی نیچر اور انسانی جذبات کو بڑی قدرت کیساتھ سمو دیا ہے جس چیز نے مجھے بالکل محو کر دیا ہے۔

مضامین میں ایسی روانی ہے کہ دریائے طبیعت موجیں مارتا چلا آتا ہے اور جس میں سے میٹھے میٹھے بول اور بلتے چلے آتے ہیں میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ قطراتِ شبنم کا پڑھنے والا اگر دل و دماغ رکھتا ہے۔ تو وہ کیونکر اُسے شروع کرکے بغیر ختم کئے چھوڑ سکتا ہے؟

مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا ایک نوجوان ادیب کی ہمت افزائی کریگی ؎

دہلی

کمترین آغا شاعر عفی اللہ عنہ

۱۶ مارچ ۱۹۳۶ء

دیباچے

از جناب سید امتیاز علی تاج لاہور

شاعرانہ نثر کے بہت مختصر مضامین گذشتہ چند سالوں میں اس کثرت
سے اُردو میں لکھے گئے اور ان میں سے بیشتر اس قدر کھوکھلے اور طرح
طرح کی علامات وقف سے اس درجہ پُر تھے کہ پڑھنے والے ان سے
اُکتا کر رہ گئے۔ اور اس نوع کے مضامین سامانِ ظرافت بنکر رہ گئے۔
لیکن نئے ادیبوں کے ایسے مضامین دیکھتے وقت مجھے ہمیشہ اس
بات کا خیال رہتا ہے کہ اُردو کے اکثر نامور ادیبوں نے اسی صنف
ادب میں طبع آزمائی کرکے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

نئے ادیب غالباً اس وجہ سے شاعرانہ نثر کے نہایت مختصر مضامین
لکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کہ ایک تو ان مضامین میں مُسلسل اور

قائم محنت سے کام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور دوسرے اس صنف ادب میں کسی خاص صناعت کا دخل نہیں۔ اتنا ہی کام ہوتا ہے کہ ایک خیال یا تاثر کا اظہار تسکین بخش الفاظ میں کر دیا جائے۔

ان حالات میں نئے ادیبوں کے شاعرانہ نثر کے مختصر مضامین میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں پست چیزیں ادب اُردو کی کون سی صنف میں نہایت کثرت سے نہیں لکھی جاتی۔ لیکن ہونہار ادیبوں کے مختصر شاعرانہ مضامین میں بارہا ایسے نازک اور نئے تاثرات کے اظہار کی کامیاب مساعی بھی نظر آجاتی ہیں۔ جن سے اُردو الفاظ اس سے پیشتر متعارف نہیں ہوئے ہوتے۔

بابو گوردھن داس صاحب بی۔ اے کے جو مختصر شاعرانہ مضامین "قطراتِ شبنم" کے نام سے پریس میں جا رہے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ عمیق مشاہدہ۔ فلسفیانہ فہم اور حسین و جمیل اندازِ اظہار صاف کہہ رہا ہے کہ جس قلم سے ایسی تصنیف پہلے پہل نکلی ہے اسکی اگلی تصنیفات ایک روز اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار ہوں گی۔

دیباچہ

(از مولانا سیّد اظہر حسن زاہدی بی۔اے مدیر روزنامہ زمیندار لاہور)

ادب اُردو ارتقائی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے اور اس کی دلکشیوں اور رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی ترقی کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ اور بہت سے نوجوان ادبا بہت اچھی خدمتِ ادب کر رہے ہیں۔ مسٹر گوردھن داس بی۔اے بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہایت ذہین۔ لائق خوش طبع اور ہونہار نوجوان ہیں۔ اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔

وہ پروفیسر لالہ تیج رام صاحب آنجہانی ایم۔اے سابق پروفیسر مدھیر کالج کیمپ جہلم کے فرزند ارجمند ہیں۔ لالہ صاحب نے بہت سی تعلیمی کتابیں

لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ موصوف نے علمی ذوق اپنے والد محترم سے ورثہ میں پایا ہے۔ وہ ہنوز تحصیل علم سے فارغ نہیں ہوئے۔ لیکن یہ امر قابل تعریف ہے کہ انہوں نے اپنی گوناگوں طالب علمانہ مصروفیات کے باوجود ادبی مشاغل کو جاری رکھا اور ابھی سے خدمتِ ادب شروع کردی۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی کہ وہ خوش ذوق اور خوش فکر ادیب ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہوکر ادب اُردو کی اور زیادہ شاندار خدمات انجام دینگے۔

ابھی اُردو میں مقالہ نگاری نے مستقل صنف کے طور پر ایسی ترقی نہیں کی جیسی وُہ انگریزی میں کرچکی ہے۔ لیکن تدریجی ترقی کا یقیناً آغاز ہوچکا ہے تاہم بیانی و تخیلی دونوں قسم کی مقالہ نگاری میں ابھی بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے۔ علاوہ ازیں تخیلی مقالہ نگاری میں ٹیگور نے ایک خاص رنگ اختیار کیا ہے۔ جو نہایت دلکش ہے اور اُردو

پر اسکا خاص اثر ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اسکا تتبّع بہت دشوار ہے کیونکہ اس کے لئے ایک بے حد ترقی یافتہ فلسفیانہ دماغ کی ضرورت ہے۔ عام طور پر نوجوان ان کے اتّباع کی جو کوشش کرتے ہیں وُہ بہت بھونڈی اور مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ بہرکیف مسٹر گوردھن داس نے اپنے اس مجموعۂ مضامین میں جسے انہوں نے "قطراتِ شبنم" کے نام سے موسوم کیا ہے جو تخئیلی مضامین درج کئے ہیں۔ وُہ اپنے اندر ایک جاذبیت اور دلکشی رکھتے ہیں اور ان میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ کہیں روزمرّہ کے واقعات و مشاہدات سے عبرت حاصل کی گئی ہے۔ کہیں مناظرِ قدرت کے تاثرات بیان کئے گئے ہیں۔ کہیں محبت کے لطیف جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کہیں اُس کی رنگینیوں کا دلکش فسانہ ہے اور کہیں اس کی جاں گدازیوں کی دردناک داستان کہیں حسنِ ازل کے جلوؤں کا عرفان ہے۔ اور کہیں روحانی کیف و سرور کی تجلیّاں۔ غرضیکہ یہ ایک نوجوان ادیب کی ایک نہایت قابلِ تعریف

کوشش ہے جس سے اس کی خُدا داد قابلیّت و صلاحیت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اہلِ ذوق کیلئے اسکا مطالعہ یقیناً موجب انبساط ہو گا۔ کیونکہ یہ ایک حسّاس اور دردمند دل کے رنگین تاثرات ہیں۔

زاھدی

لاہور
۲۷ر مارچ ۱۹۳۶ء

نوذھن داس

قطراتِ شبنم

قطراتِ شبنم ایک ایک کر کے اور وہ بھی کبھی کبھی اکٹھے کئے گئے۔

اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ ان کو ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

گلشنِ عالم کی اس مختصر گلگشت میں دل و دماغ نے جو اثر اس

سے قبول کیا اس کو الفاظ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ سِلسِلہ مضامین جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کسی ایک نوع

پر یا کسی ایک عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ انسانی جذبات اور احساسات

کا ایک مرقع ہے جو تھوڑا تھوڑا کر کے وقتاً فوقتاً صفحۂ قرطاس پر کھینچا گیا۔

بہرکیف جو کچھ ہے حاضر ہے ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

لاہور۔ یکم اپریل ۱۹۳۸ء

گوردھن داس

انتہائی ناشکری کا مقام ہوگا اگر میں اس سلسلے میں اپنے اُن بزرگانِ کرام اور رفیقانِ محترم کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی مساعی اور اعانت اس "مجموعہ" کو آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنیکا موجب بنیں۔

سب سے اول قبلۂ محترم جناب مرزا حامد حسین صاحب ایم۔ اے شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ یہ آپ ہی کے فیضانِ فیض کا نتیجہ ہے۔ آپ اس سلسلہ میں میرے رہنما ہیں۔ صاحبِ موصوف نے اپنا گرانقدر اور قیمتی وقت اس مجموعہ کی ترمیم و تصحیح میں صرف فرمایا۔

اس کے بعد عالیجناب واجب الاحترام افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی کا ممنون ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں میری مزید حوصلہ

افزائی فرمائی اور صاحب موصوف کے محترم صاحبزادے جناب آغا مسرور قزلباش۔ جناب امتیاز علی تاؔج۔ مولانا سید اظہر حسن زاہدؔی مدیر بلند اؔر لاہور جناب پروفیسر عبدالعزیز قریشی ایم۔ اے گورنمنٹ کالج روہتک جناب پروفیسر ایس۔ ایم۔ پال ایچ اے۔ ایچ۔ پی فارمن کرسچن کالج لاہور۔ مسٹر نرلبش چندر بھٹناگر ادیب فاضل سکرٹری انجمن اُردو ادب بھوانی کامر ہون منت ہوں۔ مذکورہ بالا اصحاب ذی احترام کا مخلصانہ مشورہ اور اعانت اس سلسلہ میں میرا شامل حال رہا۔

شیخ رشید احمد صاحب نے "قطرات شبنم" کی کتابت وطباعت کے سلسلے میں میری پوری اعانت فرمائی اور مسٹر ایف۔ ای چودھری نے مختلف تصاویر عنائت کیں جس کے لئے میں ہر دو اصحاب کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں۔

گوردھن داس

لاہور۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۶ء

قطرات شبنم
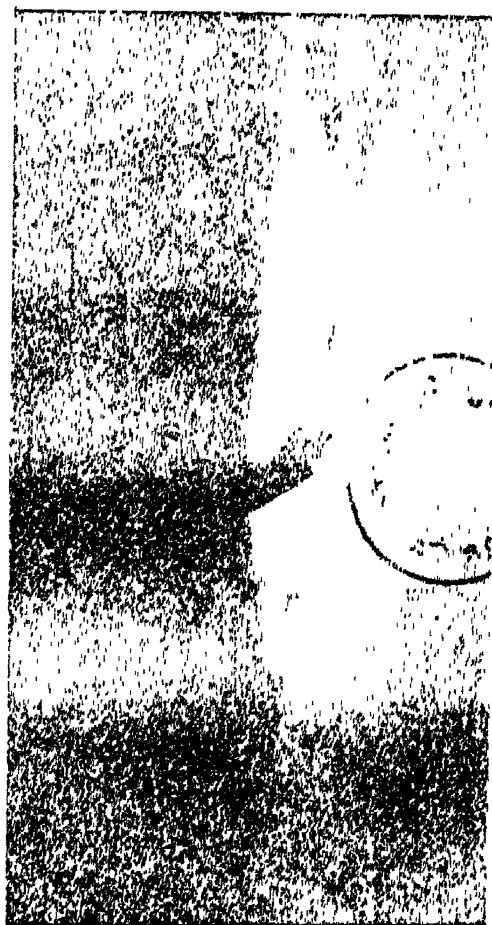
اُٹھ

بھائی!

اُٹھ جاگ اب نیند تجھ پر حرام ہے۔

دیکھ ماں رو رہی ہے۔

ماں! چپ رہ۔ صبر کر۔

تیرا بچہ اسقدر مدہوش و سرشار نہیں کہ وہ تیری خبر تک نہ لے۔ اگر تیرا سہاگ اجڑ گیا۔ تو غم نہ کر تیرے حنائی ہاتھوں کی چوڑیاں تڑوانے والے اب اور یہاں نہیں رہ سکتے۔

بھائی!

اُٹھ جاگ۔ دیکھ تیری ماں کا کیا ابتر حال ہے کیا تجھے رحم نہیں آتا کیا تجھے خیال نہیں کہ وہ دشمن کے ہاتھوں سے تنگ آگئی ہے۔

بھائی

اُٹھ جاگ۔ اب نیند تجھ پر حرام ہے۔

امتحان

دوسرے دن تاریخ کا پرچہ تھا۔ میں نے ہندوستان اور یورپ کی ضخیم تاریخیں اٹھائیں ختم تو یہ رات بھر میں کیا ہوئی تھیں۔ ورق گردانی کی نیت سے دونوں کو سامنے رکھ لیا۔

ایک کو آگے سرکا کر ورق جو کھولتا ہوں تو عبادت ندارد۔ ایک عجیب تصویر آنکھوں کے سامنے تھی۔ آنکھوں سے انتہائی چالاکی۔ پیشانی سے فکر مندی اور فریب کاری چہرے سے خباثت و مکاری اور خونخواری ٹپک رہی تھی۔ عنوان تھا "سیاست" تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"میرا نام سیاست رکھا گیا ہے۔ مگر در اصل میں طاقت کی بھوکی ہوں میں حرص اور ظلم کی پتلی ہوں۔ میرا اصول ہے۔ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ مجھے غیر مہذب ممالک کے وحشی باشندوں کی الم ناک زندگی پر

بڑا ترس آتا ہے۔ میں ان کو غلام بنا کر رفتہ رفتہ انہیں قیدِ ہستی سے ہی آزاد کر دیتی ہوں۔"

میں نے گھبرا کر صفحہ الٹ دیا۔ تو اس سے زیادہ عجیب تصویر نظر آئی۔

بڑی بڑی مونچھیں۔ خون آشام نگاہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے قیصر جرمنی یا زارِ روس غصہ سے دانت پیس رہا ہے۔ یا ہٹلر یا مسولینی نہایت مشتعل ہو کر تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ عنوان پر درج تھا۔ "یہ مرقع حکومت کا ہے"۔ تصویر کے نیچے درج تھا:——

"میرا اولین اصول یہ ہے کہ "نفاق ڈالو اور حکومت کرو"۔ میری آخری دلیل تلوار ہے۔ لیکن میرا ہر حربہ مؤثر ہے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سی۔ آئی۔ ڈی۔ پولیس فوج خطابات۔ کمیونل ایوارڈ اور کیا کچھ نہیں۔ ایک مرتبہ دسترخوان پر مدعو کر لینے کے بعد ایسا

کامیاب سحر اور ایسا زبردست منتر اپنے مہمان پر چلاتی ہوں کہ جتنا زیادہ وہ سیانا ہو اور اپنی قوم کا ایک سرگرم اور محب وطن کارکن ہو اتنا ہی زیادہ غدار فریبی اور قوم فروش بن جاتا ہے۔"

اس سے زیادہ میں نہ پڑھ سکا اور میں نے حیرت کے ساتھ کتابیں بند کر کے الماری میں رکھ دیں ؂

بہترین خزانہ و جائداد

اے ماں تُو نے میری جائداد دیکھی ہے؟ محل باغ موٹر گاڑی ہاتھی گھوڑا اور بہت سا سامان جو بڑی محنت سے جمع کیا ہے۔

میری جائداد ان دُنیاداروں کی جائداد سے کم قیمتی نہیں پھر بھی ان کی جائداد سے بڑھ کر ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں جان خطرے میں نہیں پڑتی۔ اس کے ضائع ہونے کا دائمی ملال نہیں ہوتا۔

مجھے اس کے جمع کرنے میں بہت سی قربانیاں اور ایثار اور جفا کشی سے کام لینا پڑا۔ مگر میں بخیل نہ بنا۔ میں اپنی تمام دولت ہر خواہشمند کو دے سکتا ہوں۔ اس میں میں اپنے ہر ساتھی کو خوشی کے ساتھ شریک اور برابر کا شریک کر سکتا ہوں۔ اس کی حفاظت کی فکر میں میری راتوں کی نیندیں حرام نہیں ہوتیں میں اس خزانے

کو سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ ضرور رکھتا ہوں اور اس سے محبت بھی کرتا ہوں مگر میں اس پر اپنی جان نہیں دیتا۔

اس نے مجھے خودغرض نہیں بنایا۔ اس کی وجہ سے میں احسان فراموش نہیں ہوا۔ اس کے لئے میں نے دوسروں کو ایذا پہنچانا نہیں سیکھا۔ اس کے باعث میں نے تیری یا اپنے کسی دوسرے محبوب اور محسن کی محبت اور احسان شناسی کو فراموش نہیں کیا۔ اس کو میں نے اپنا خدا نہیں بنایا۔ اے ماں میرا خزانہ نیکی کا سرچشمہ ہے۔

اے ماں! سنگدل دنیاداروں کے پاس اگر زمین کھود کر نکالے ہوئے کنکر پتھر اور دھاتوں کے ٹکڑے کثیر مقدار میں ہیں اور تیرے پاس بالکل نہیں تو نہ سہی۔ میں تو ان کو بالکل بیکار سمجھتا ہوں۔ کسی کے پاس بہت سے ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ خود ان کو ان سے کیا نفع اور دوسروں کو ان سے کیا فائدہ ۔

اے ماں! میرے خزانے میں سب کچھ ہے۔ میری جائداد بڑی وسیع و عالیشان ہے۔ اس کو معمولی ٹوٹے پھوٹے کھلونے نہ کہہ۔ دیکھ یہ لکڑی کبھی میرا گھوڑا بن جاتی ہے کبھی ہاتھی۔ دیکھ میرے پاس تیر و کمان بھی ہیں جن سے میں نے دنیا کو بغیر خون بہائے فتح کیا ہے اور کرونگا۔ دیکھ یہ میری ناؤ ہے اس پر سوار ہو کر میں دنیا کی سیر کرتا ہوں اور بڑا ہو کر اسی کی بدولت میں ملک التجار بنوں گا۔

اے ماں! غمگین نہ ہو۔ تو ملکہ ہے میں تیرا شہزادہ ہوں۔ تیری خزانہ و جائداد ہوں۔ میرے خزانے میں کیا نہیں ہے سب کچھ ہے۔ بس صرف دنیا والوں کے غم و فکر۔ رنج و پریشانی تعصب و تنگدلی اور گناہ و شقاوت نہیں۔ ماں! مجھے اپنی دعاؤں کی برکت اور محبّت کے سائے میں لیلے ..

دُکھیا ماں

تجھے کس نے ستایا ہے ماں؟ تیرے بال بکھرے ہوئے ہیں۔
تیری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ تو رو رہی ہے۔ ماں! پیاری ماں تجھے
کس نے ستایا ہے۔
تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ تیرے دشمنوں کو نیست و نابود
کر دینگے۔
ماں۔ تو غم نہ کر۔ تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔
ماں وہ کمزور نہیں ہیں۔ ان میں ہمت ہے۔ حوصلہ ہے۔ دل
ہے۔ دماغ ہے۔ سب ہے ماں۔ سب کچھ ہے۔ ماں تو فکر نہ
کر غم نہ کر۔
وہ دن گئے ماں۔ جب وہ بچے تھے۔ جب وہ نادان تھے۔

اب وُہ تیری عزت اور آبرو کو سمجھتے ہیں۔ ان میں عقل آگئی ہے۔ وہ کرینگے ماں سب کچھ کرینگے وہ تیرے دشمنوں کو پچھاڑ دینگے۔ ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں گے۔

ہاں ماں ـــ تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

جب وُہ سب ملکر تیرے گرد جمع ہونگے۔ تو تو خوش ہو جائیگی تو مسکرا دے گی۔

تیری خوشی کا ٹھکانا نہ رہیگا۔ اور جب وہ سب ملکر تیری جے کے نعرے لگائیں گے۔ تو تیرے دشمن دہل جائینگے۔ کانپ اٹھیں گے۔

جب وہ حسن و عشق۔ دھرم ادھرم۔ مذہب و ملت کے جھگڑے چھوڑ کر میدان میں آئینگے۔ اور دشمنوں کو للکاریں گے تو دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جائینگے۔ وہ تجھے خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھائینگے۔ تیرے سر پر تاج رکھیں گے تیری پرستش کرینگے۔ تو تو ان دُنوں کو بھول جائیگی ماں۔ یقیناً بھول جائیگی۔

ہاں ماں۔ تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں ۔:۔

"آ پنجرے میں!"

صیّاد نے کہا۔ آ اس پنجرے میں آ۔ میں تجھے دنیا کی تمام نعمتوں سے مالامال کر دونگا۔ دیکھ میں تیرے لئے یہ دو نقرئی کٹوریاں لایا ہوں۔ ایک میں ٹھنڈا پانی اور دوسری میں دانہ۔ یہ چھوٹی چھوٹی جھانجنیں تیرے پاؤں میں کیا ہی خوشنما معلوم ہونگی۔ آ۔ اس پنجرے میں آ اور آکر میرے غمگین دل کو اپنے دل خوش کن نغموں سے خوش کر۔

بلبل نے کہا بھولے انسان کیا آزاد غلام ہو کر خوش رہ سکتا ہے۔ ہمارے نغمے ان جنگلوں کی جھاڑیوں پر ہی خوشنما معلوم ہوتے ہیں یہاں یہ خوشی کے نغمے اور وہاں سلاخوں کے درمیان نوحہ وزاری بھولے انسان تو خود غلام ہے۔ دوسروں کو اپنا سا مت سمجھ۔

یہ سمجھانا نہیں کیا میرے سے لئے بڑیوں سے کم ہیں۔ ہر کسی کو غلام ہی نہ دیکھو۔ یہاں آزاد ہیں۔ اور آزاد ہی رہنا چاہتے ہیں ۔

آنسو

غریب اور بیکس غلام کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو کو دیکھ کر بے پرواہ نہ بن۔ اُسے بے حقیقت نہ جان۔ اس ایک قطرہ میں ہزار طغیانیوں سے زیادہ طاقت پنہاں ہے۔ یہ آنسو تمام دنیا کو غرق کرسکتا ہے۔

ظالم۔ اُس کا ایک قطرہ ایک بحر ناپیدا کنار ہے *

کارِ ثواب

مولوی صاحب فرمانے لگے۔ "عالموں کی خدمت کرو۔ ان سے سلوک کرو۔ ان کے لئے پیسے خرچ کرو۔"

مہنت جی بولے "کتھا کراؤ۔ مندر کنوئیں بنواؤ۔ سدا برت جاری کرو۔ سادھو سنتوں کو حلوا پوری کھلاؤ۔"

پیر فقیروں نے کہا۔ "خیرات بڑے ثواب کا کام ہے سخی کا نام ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ خدا نیک کاموں کو بہت ثواب بخشتا ہے۔"

لیڈر نے کہا "قوم کی حالت خستہ ہے۔ کمیٹی بناؤ اور چندہ دو۔"

ضمیر نے آواز دی "اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ اپنی

صحت قائم رکھو۔ اور ایک حد تک غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرو۔ سب سے زیادہ مقدم اپنے فرض منصبی کو سمجھو یہی تمہارا سب سے بڑا فرض اور یہی بڑے ثواب کا کام ہے''۔

اعتقاد

"پاگل کس کی پوجا کرتا ہے۔ مٹی پتھر کی؟"

"یہ خدا ہے۔ مٹی پتھر نہیں ہے۔"

"یہ کیسا خدا؟ جس کے میں ٹکڑے کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ٹکڑے مٹی پتھر کے کر سکتے ہو۔ خدا کے نہیں۔"

"مگر تو اس تودے کی پوجا کیوں کرتا ہے۔"

"میرا خدا مٹی پتھر نہیں۔ میں نے اس میں اپنا اعتقاد رکھا ہے

میرے اعتقاد نے اس بے جان پتھر کو خدا بنا دیا ہے۔"

فردوسِ بریں کا سیدھا راستہ

پجاری کہنے لگا "دیوتا تم سے پرسنّ ہو جائیں گے۔ اگر تم دھیان سے ان کی پوجا کرو۔ ایٹھو بھگوان کے آگے سر جھکاؤ۔ تمہیں سورگ میں استھان ملیگا۔"

درویش بولا "بابا دھن دولت کے موہ میں اپنا گیان دھیان گندہ نہ کر۔ دنیا کے دھندوں میں اپنے آپ کو نہ پھنسا۔ مایا کے جھگڑوں سے اپنے ضمیر کو آلودہ نہ کر۔ مالک سے دل لگا۔ اور پھر تجھے بہشت مل جائیگی۔"

واعظ گرج کر بولا "شراب مت پیو۔ نشہ مت کرو۔ خدا سے ڈرو۔ تمہیں جنّت میں جگہ مل جائیگی۔"

کسی نے کہا "جنت تو اس جگہ کا نام ہے جہاں محبت

رہتی ہے۔ محبّت کرو۔ یہی فردوسِ بریں کا سیدھا راستہ
ہے"۔

رازِ سربستہ

میں نے پوچھا۔ تم منہ چھپا کر کیوں مسکراتے ہو۔

بولے۔ "تو کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ پھول رات کو کیوں کِھلا کرتے ہیں"۔

ماں!

ماں! کیا تم مجھے بھول گئی ہو ؟

تم مجھے پھولوں اور نوخیز کلیوں سا خوبصورت کہا کرتی تھیں۔
کیا جہاں تم چلی گئی ہو پھول نازک اور خوبصورت نہیں ہوتے
جو تمہیں میری یاد دلائیں۔

ماں! کیا تم مجھے بھول گئی ہو ؟

ماں! کیا جہاں تم چلی گئی ہو۔ مجھ جیسے بچے کھیلتے اور شرارت
نہیں کرتے ؟

ماں! کیا وہاں مائیں ہی مائیں ہیں۔ کیا اُن کے بچے اُن کے
پاس نہیں ؟

ماں! کیا تم مجھے بھول گئی ہو ؟

داغ مفارقت

اے گلچین رحم کر۔

اپنی جھولی ان بے قصور اور نازک غنچوں سے نہ بھر جن کی خوبصورتی کو ابھی تک دنیا والوں نے نہیں دیکھا۔

اپنا دامن ان کے خون سے نہ رنگ جنکا شباب ابھی آنیوالا ہے۔ جنکا منہ ابھی شبنم نے نہیں دھویا اور جنہیں ہنوز چاند کی سیمیں کرنوں نے نہیں چوما۔

اے گلچیں رحم کر ان بیگناہ غنچوں پر ان پاک کلیوں پر جن کی خوشبو سے چمن مہکنے والا ہے۔

اے گلچین۔ اپنا دامن ان کے خون سے نہ رنگ۔

سلہ مکرمی مرزا حامد حسین صاحب کے فرزند عزیزی ظفر الاسلام مرحوم کی وفات حسرت آیات کے موقعہ پر لکھا گیا۔

عقلمند بچہ

ماں! کیا تم جانتی ہو۔ کہ صبح سویرے پھولوں پر اسقدر شبنم کہاں سے آتی ہے۔ تم کہو گی۔ ہوا کی نمی بوندوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کس قدر بے معنی بات ہے۔ ماں یہ تو پریوں کے آنسو ہیں۔

ماں! کیا تمہیں معلوم ہے کہ چاند اور بادل آپس میں کیا کیا کھیل کھیلتے ہیں اور ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ کہ تم اس کے متعلق ایک بات بھی نہ بتلا سکو گی۔ دیکھو۔ بادل ماں ہے اور چاند اس کا بیٹیا۔

بادل ماں چاند کو اپنی گود میں چھپا لیتی ہے ۔

بچہ "آ۔ اے نوجوان آمیرے ساتھ کھیل۔ اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر محبت کے کھیل پھر کھیلنا۔ آؤ۔ میرے ساتھ ان پتھروں سے کھیلو"۔

نوجوان "کھیل بچے تو ہی کھیل۔ میری عمر میں تیری قسمت تجھے کیا کھیل کھلائیگی۔ کون جانتا ہے"۔

بچہ "اے بوڑھے عقلمند آؤ۔ تمہیں آؤ۔ اس لکڑی کو ادھر لاؤ۔ اس کا گھوڑا بنائیں۔ اپنے کاغذات کو لاؤ۔ جن میں تم نے اپنی علمیت کو بھر دیا ہے۔ کہ ان کی ناؤ بنا کر تیرائیں"۔

بوڑھا "پاگل ہے کھیل بچے تو ہی کھیل میری عمر میں تیری قسمت تجھے کیا رنگ دکھائے گی۔ کون جانتا ہے"۔

بنسری والا

بنسری والے نے اپنی بنسری اُٹھائی اور بے فکری سے بجانے لگا۔ بنسری سے ایک سریلا راگ نکلا۔ ایک میٹھا نغمہ جس کے مزے روحِ کائنات کو ملنے لگے۔

تیتریوں نے پھولوں کے گرد ناچنا چھوڑ دیا۔ بھونرا مست ہوکر ایک پتی پر بیٹھ گیا۔ بُلبُل ایک شاخ پر بیٹھ کر سر دھننے لگی۔ بہتی ہوئی ندیاں ٹھہر گئیں۔ چلتی ہوئی ہوا رُک گئی۔ آسمان پر بادلوں نے اپنی دوڑ بند کر دی۔ سورج غروب ہونا بھول گیا۔ فضا خاموش ہوگئی اور کائنات ایک نیم مدہوشی میں محوِ خواب ہوگئی۔

بنسری والا خود بھول گیا کہ وہ کون ہے اُس کے گرد و پیش کیا ہے۔ اور اُسے کیا کرنا ہے۔ یکایک بنسری اس کے ہاتھ سے چھوٹ

گئی۔ وہ خود بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ راگ بند ہو گیا نغمہ ختم ہو گیا۔

کائنات پھر جاگ اٹھی۔ سورج اپنے سفر پر پھر روانہ ہو گیا۔ رنگ برنگ کے بادل آسمان میں دوڑنے لگے۔ ہوا پھر چلنے لگی۔ ندیاں پھر بہہ نکلیں۔ تیتریاں پھر اُڑنے لگیں۔ بھونرا پھر بھنبھنانے لگا اور بُلبُل پھر چہکنے لگی۔

مگر ذرا دیکھنا اس مرتبہ کچھ رنگ ہی اور ہے۔ کائنات حیران ہے فضا مضطرب۔ آفتاب کا چہرہ زرد ہے۔ جیسے اُس کے دل پر کوئی کاری زخم لگا ہو۔ یا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔ بادل گھبرائے ہوئے ہیں۔ ہوا سراسیمہ ہے۔ ندیاں کانپ رہی ہیں۔ لرزہ براندام ہیں موجیں لبِ ساحل سے سر پٹکتی معلوم ہوتی ہیں۔ تیتریاں بھونرے۔ بُلبلیں سب بدحواس مضطرب اور بے قرار ہیں کسی کو کہیں چین نہیں۔

اور بنسری والا بالکل مدہوش پڑا ہے۔ راگ بند نہیں ہوا۔ وہ تو شروع ہوا ہے۔ نغمہ ختم نہیں ہوا۔ وہ ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔

بانسری والے! اپنے حسین نغموں کو بند نہ کر۔
ان سے مجھے سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور ایک ابدی آرام۔
صبح کے دھندلے اُجالے ہیں اور شام کے دھندلے سائے ہیں
میری روح نہ جانے کیوں بے حد مضطرب ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا ڈھونڈتی ہے۔
یہ حسین نغمے جن میں آبشاروں سے زیادہ روانی ہے۔ جو دلوں کو کھینچ لے جانے کی بے انتہا طاقت رکھتے ہیں۔ مجھے مدہوش کر دیتے ہیں اور میں دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا ہوں۔
مجھے نیند آنے لگتی ہے۔ میں تخیل کی دنیا میں مست ہو جاتا ہوں اور میرا دماغ سرشاریوں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

مگر جب تمہاری بنسری کی آوازنرکل کی شاخوں میں گم ہوجاتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔ وہ حسین مدہوشی ختم ہو جاتی ہے۔
دریا کے اس پار پھر خاموشی ہوتی ہے جھینگر بولتے ہیں۔ اور ندی کا پانی زور کرتا ہے۔ اور میں ——— میرے دل میں خیالات دریا کے پانی کی طرح لہریں لیتے ہیں۔ اور میری روح تمہارے حسین نغمے سنتی ہے۔ اور وجد کرتی ہے۔
اے بنسری والے اپنے حسین نغموں کو بند نہ کر۔

شہرِ خموشاں

اس شہر کا نام شہرِ خموشاں ہے۔ یہاں ہُو کا عالم ہے۔ نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی حرکت۔ جدھر آنکھ اٹھاؤ۔ ایک سنسان چٹیل میدان نظر آتا ہے۔

اس میں رات کے وقت گیدڑوں کی آوازیں گونجتی ہیں یا کہیں کہیں دردناک سُرخ و سفید آگ کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ شہر عجیب ہے۔ یہاں کے رہنے والے عجیب ہیں اور ان سے وابستہ باتیں بھی عجیب ہیں۔

کوئی نہیں جانتا اس شہر کی آبادی کتنی ہے اور روز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں کے رہنے والے مٹی میں سوتے ہیں مٹی کھاتے ہیں اور مٹی ہی سے دل بہلاتے ہیں۔ ہر ایک انسان کی منزلِ مقصود یہی ہے ✣

اے ترک سوار!

اے ترک سوار! ذرا ٹھہر جا۔

تیرے گھوڑے کے سُموں سے پیدا ہونے والی آواز میرے دل میں
لرزہ پیدا کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ سے گگری گرنے کو ہے۔

اے ترک سوار! ذرا ٹھہر جا۔

غریب جانور تھک گیا ہے۔ اس پر رحم کھا۔ اور آج دوپہر اس آم
کے پیڑ کے نیچے آرام کر۔

اے ترک سوار! ذرا ٹھہر جا۔

اس کے ٹاپوں سے اڑتی ہوئی گرد میرے اور تمہارے درمیان دیوار
کی طرح بن رہی ہے۔ کچھ تو خیال کر۔

اے ترک سوار! ذرا ٹھہر جا۔

سفرِ آخرت

طوفان آگیا ہے۔
آندھی اور ہوا کے جھکڑ چل رہے ہیں۔
رات تاریک ہے۔
بجلی کڑکتی ہے بادل گرجتے ہیں۔
موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اور تم اکیلے ہو۔
تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟

زندگی کے اس طوفان میں۔ حوادث کی ان آندھیوں میں۔ یاس کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں امید کی بجلیوں کی چمک میں۔ مصائب کی بارشِ پیہم میں۔

اے پردیسی تم اکیلے کیوں سفر کر رہے ہو؟

اے مسافر میں بھی پردیسی ہوں۔ مجھے بھی وہیں جانا ہے جہاں تم جا رہے ہو۔ ہم سب کی آخری منزل وہی ہے۔ ایک سے دو بھلے۔ مجھے بھی ساتھ لے لو۔

ہم تم اس زندگی کے سفر میں اکٹھے کیوں نہ چلیں؟ آؤ ہم تم دونوں ملکر ان طوفانوں کا مقابلہ کریں۔ باہم اس اندھیرے سے نکل کر اجالے میں پہنچیں اور ابدالآباد کی منزلِ مقصود تک پہنچیں۔

جہاں یہ ہنگامے نہیں بلکہ امن اور سکون کی فضا میں ——————

اس دار فانی سے —————— کی طرف مسافرت کرنے کے عازم اس سفر میں ایک رفیقِ حیات کی سخت ضرورت ہے۔

تیرا سفر میرے ساتھ عمدگی اور کامیابی سے کٹیگا۔

مجھے بھی تیری رفاقت میں روح کی تسکین، راستے کا پتہ اور منزل کا دھیان رہیگا۔

اے مسافر مجھے بھی اپنے ساتھ لے لو۔

تھک گیا ہوں

تمام رات کارواں کے ساتھ چلتا رہا ہوں۔ اب کہ سحر ہونے کو ہے۔ میں تھک گیا ہوں میرے پاؤں اب آرام چاہتے ہیں۔ ایک مکمل آرام۔

میرا راگ خاموش ہوتا جا رہا ہے۔
وہ وقت ہے جبکہ چراغِ سحر ٹمٹماتا ہے۔
مارے ڈر کے تاروں کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔
جبکہ صُبح کا ستارہ کانپتا ہے۔ تھرتھراتا ہے۔
شبِ ہجر تمام ہوتی ہے۔ نُور کا ظہور ہوتا ہے۔

اے میرے نور۔ میرے محبوب تو بھی آ۔ کہ شبِ ہجر تمام ہوا اور تھک کر سو جانے پر تم سے ہمکنار ہو سکوں۔

سحر ہو رہی ہے۔ محبوب۔ چراغِ زندگی چراغِ سحری بنا ہے۔
مارے ڈر کے رنگ فق ہوا ہے۔
آؤ۔ محبوب دور کر دو۔ دردِ فرقت کو۔ تاکہ مجھے بھی راحت ملے
آرام ملے۔ نیند خوب آئے جی بھر کر۔ ایسا سوؤں پھر کبھی نہ اٹھوں۔
تمام رات کارواں کے ساتھ چلتا رہا ہوں۔ اب جبکہ سحر ہو گئی
ہے۔ میں تھک گیا ہوں ٭

آؤ۔ ندی کے اس پار چلیں اے محبوب۔

اس پار جہاں ہم تاریکی دیکھتے ہیں۔ ڈرو مت محبوب وہاں تاریکی نہیں چاندنی ہے۔ وہ چاندنی جو دکھائی دینے والی تاریکی سے پرے ہے۔ وہاں خاموش چاندنی آبِ حیات کی بارش برسا رہی ہے۔

آؤ۔ ندی کے اس پار چلیں۔ اے محبوب۔

اس جگہ اس دنیا کے دریا کے طوفانوں کا شور۔ آندھی اور بجلی کی آواز ہم تک نہیں پہنچے گی۔

اے محبوب آؤ۔ ندی کے اس پار چلیں۔

اس خاموشی میں ہم محبت کے پاک رشتے کو جوڑیں۔ یہ رشتہ

اس دنیا کے شور و غل میں بکھر جائیگا۔

آؤ۔ ندی کے اُس پار چلیں۔ اے محبُوب ۔

انتظار

مجھے خبر ملی۔ کہ تم آرہے ہو۔ تم سے ملنے کی امید نے مجھے بستر مرگ سے اُٹھا بٹھایا۔ میں نے نیا لباس پہنا۔ اور کامیابی انتظار کے شوق نے آرائش وزیبائش سے میرے حسن پژمردہ میں عجب نکھار پیدا کر دیا۔ سب مجھے نہایت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مگر آج میں غافل و بے پروا بے انتہا خوش تھی۔ کیونکہ آج مجھے اپنے آقا سے ملنا تھا۔ میرے آقا۔ آپ کو خوب معلوم ہے۔ کہ میں آپ کا کتنا انتظار کرتی رہی۔ میرا سنگار بگڑ گیا۔ میرے بالوں میں لگے ہوئے پھول مرجھا گئے اُن پر راہگیروں کے پاؤں کی گرد جم گئی۔

اور اب جبکہ صبح سے شام ہو گئی ہے۔ اور انتظار دید و ملاقات میں میری بہار کی خزاں اور جوانی بلکہ زندگی کی شام ہونے آئی ہے۔ تم

آئے ہو۔ اور خاموشی سے میرے نزدیک سے گذر جانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم مجھے نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

کیا کر رہے ہو میرے آقا! میرے اس شدید انتظار کو جسے تم خوب جانتے ہو۔ ناکام نہ بناؤ۔ تم اس طرح تو مجھے میری تمنا و آرزو کے دشوار گذار راہ میں اپنی سبک رفتار محشر خرامی سے پامال نہ کرو۔

"منزلِ مُقدّس"

میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں نے نجانے اپنے پریتم کی تلاش میں کتنے شہر چھان ڈالے ہیں۔ مگر میری منزل ابھی دور ہے۔

میں نے بستی چھوڑ دی۔ لہلہاتے ہوئے کھیت آئے اور پیچھے رہ گئے جنگلوں میں خودرو پودے بہار دکھا رہے تھے۔ وہ بھی پیچھے رہ گئے۔ اسی طرح بستیاں آئیں اور گذر گئیں۔

مگر میری منزل ابھی بہت دُور ہے۔

اور یونہی دن رات ہفتے۔ مہینے اور سال اور پھر اسی طرح گرمیاں۔ برسات سردیاں اور خوشنما بسنت آتے اور چلے جاتے ہیں۔

مگر میری منزل ابھی بہت دُور ہے۔

چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ بڑھے ہوئے بال گرد
سے اٹ گئے ہیں۔ ناخن بڑھ گئے ہیں۔شکل بھیانک ہوگئی ہے۔
جو ملتا ہے۔ وہی پوچھتا ہے۔تم اس خستہ حالت میں کہاں جارہے
ہو۔تم اتنے تھکے ہوئے ہو ذرا دم لے لو۔آرام کر لو۔
منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے۔تم نہیں جانتے
میری منزل ابھی بہت دور ہے۔
جب بستی کی گلیوں میں سے گذرتا ہوں۔ بچے پاگل پاگل کہکر
میرے پیچھے دوڑتے ہیں۔اینٹ اور پتھر برساتے ہیں۔مگر آہ
انہیں کیا معلوم کہ اس منزلِ مقدّس کی یاد میں یہ اینٹ اور پتھر
پھولوں سے بدرجہا بہتر ہیں اور کہ
میری منزل ابھی بہت دور ہے۔

پیاسا مُسافر

میں پیاسا ہوں کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے ؟
گرمی کا موسم ہے ۔ دوپہر کا وقت ہے سخت گرمی پڑ رہی ہے
گلا خشک ہو گیا ہے ۔ زبان تالو سے لگ گئی ہے ۔ ہونٹ سُوکھ
گئے ہیں ۔
میں پیاسا ہوں ۔ کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے ؟
شاید تمہیں تکلیف ہو ۔ تم تھک جاؤ ۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ
تمہارے نازک ہاتھ لٹیا کے بوجھ کو نہ سہار سکیں ۔ لیکن میں
مرا جا رہا ہوں ۔ میرا دم لبوں پر آ گیا ہے ۔
میں پیاسا ہوں ۔ کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے ؟
میں پردیسی ہوں ۔ غریب مسافر ہوں ۔ دیکھو ! میرے ہاتھ

پیر گرد آلود ہیں۔میرے بالوں چہرے اور تمام جسم پر گرد جمی ہوئی ہے
میں بہت دور سے چل کر آ رہا ہوں۔

میں پیاسا ہوں۔کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے؟

میں نے اپنا گھر بار، دھن دولت سب چھوڑ دیا ہے۔اس پیاس نے مجھے نہ جانے کتنی بستیوں اور صحراؤں میں پھرایا۔نہ معلوم کتنے جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھنوائی ہے۔

میں پیاسا ہوں۔کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے؟

دکھوں نے مجھے جلدی ہی بُوڑھا کر دیا ہے۔میرے چہرے اور بدن پر مصیبتوں کی جھرّیاں پڑ گئی ہیں۔میری عقل جواب دے گئی ہے۔میرا دماغ ناکارہ ہو گیا ہے۔میں پاگل ہو گیا ہوں۔

میں پیاسا ہوں۔کیا تم مجھے پانی نہیں پلاؤ گے؟

پرندے اس قدر اونچے اُڑ اُڑ کر کس کی تلاش کرتے ہیں۔
بادل کس کی تلاش میں اس قدر مسافت طے کرتے ہیں۔
رات کو آسمان سے دیوتا تاروں کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک
کر کیا دیکھا کرتے ہیں۔
چمن میں پھول جھک جھک کر کس کی راہ تکتے ہیں۔
بن کی رانی ندی کس کی تلاش میں بن کا کونہ کونہ تلاش کرتی
ہے۔
وہ نہیں جانتے کہ وہ جس کو تلاش کرتے ہیں اُس کا نور خود
اُن میں موجود ہے ۔

ٹھہر جاؤ بھئی مسافر! ذرا ٹھہر جاؤ۔ تم نے ابھی میری پوری بات تو سنی ہی نہیں۔ تم تو دم ہی نہیں لیتے۔ یہ آخر تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟ تم گھبرائے ہوئے سے اتنے تیز کیوں چلا کرتے ہو؟

ذرا ٹھہرو۔ آؤ ذرا ادھر اُدھر کی باتیں کریں کچھ آپس میں صلاح ومشورہ کریں۔ مجھے اپنا صورت آشنا تو ہونے دو۔ تمہاری بھولی صورت تمہاری معصوم فطرت کی شہادت دیتی ہے۔

میں تم سے زیادہ قریب ہونا چاہتا ہوں کچھ دیر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو سنتے ہی نہیں۔ اللہ اللہ اتنی تمکنت! اس قدر متانت! اس درجہ استغنا! تم تو نہایت متکبر معلوم ہوتے ہو۔ آخر اس غرور کی بھی کوئی حد ہے۔ میری بات ہی نہیں سنی نہ معلوم کس دُھن میں جا رہے

رہو۔ اور کس فکر میں غلطاں و پیچاں ہو۔ تم کیا کسی سے رُوٹھ کر نکل کھڑے ہوئے ہو۔

تم تو روز اسی طرح کرتے ہو۔ بادلوں کی سفید نیلی۔ کالی پہاڑیاں برابر پیچھے چھوڑے جاتے ہو۔ اور بڑی بے اعتنائی سے دامن بچا کر صاف نکل جاتے ہو۔

مسافر! تم تو بہت ہی تیز رفتار ہو۔ بھولے بھالے نادان بچے تمہیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر بلاتے ہیں۔ پکارتے ہیں۔ وہ تم سے کیا ہی مانوس ہیں۔ کیسے خوش ہیں۔ مگر تم ہو۔ کہ ان معصوموں کو جواب تک نہیں دیتے۔

تیز اُڑتا ہُوا چکور بھی تم تک نہیں پہنچ سکتا۔
بیچارہ بیچ میں ہی رہ جاتا ہے۔
سچ مسافر! تم تو بہت ہی تیز رفتار ہو۔

وفا

صبح ہوئی۔
آنسوؤں کے قطرے پھولوں کے خوبصورت چہروں پر گر پڑے۔
بُلبُل جاگی۔
چمن میں پھولوں کا نکھار دیکھا۔ شبنم کے قطرے ان پر پڑے ہوئے تھے۔
سمجھی پھول روئے ہیں۔
بے چین ہوئی اور روح کی گہرائیوں سے نغمہ جانگداز پیدا کیا۔
افق پر آفتاب بلند ہوا۔
شبنم کے ننھے ننھے قطرے بخارات بن کر اُڑ گئے۔
بُلبُل سمجھی۔ آخر میری فریاد کا اثر ہوا۔
پھول ہنس بولی۔ "اب مجھے فکر نہیں، میری زندگی کیلئے کافی سامان اور سہارا مل گیا۔ تیری یہ ایک وفا مجھے عمر بھر یاد رہیگی"۔

پھول کھلے۔ مہکے۔ مسکرائے چمن کی دنیا کو اور حسین بنایا۔ بہار کا زمانہ گذر گیا۔ خزاں کے سرد جھونکوں نے پل میں اُن کی پتیاں خاک پر گرا دیں۔ خاک میں مل کر خاک ہوگئے۔

زندگی میں محبّت کا طوفان جب زور پکڑتا ہے۔ ارمان ہوتے ہیں تمنّائیں مچلتی ہیں اور حسرتیں زور کرتی ہیں۔ مگر جب اُس طوفانی سمندر کا جوش اُتر جاتا ہے۔ ارمان حسرتیں اور تمنائیں آنکھوں کی راہ آنسو بن کر نکل جاتے ہیں۔

بچپن میں لاڈ پیار جوانی میں رنگین محبت ــــــــ کسقدر شاندار معلوم ہوتی ہے زندگی۔ مگر پھر بڑھاپا سب کچھ ایک طوفان میں بہا کرلے جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی کشتی ہوتی ہے دنیا کے سمندر میں غوطے کھاتی

منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنی ہے۔ چٹان سے ٹکرا کر بیچ میں ہی پاش پاش ہو جاتی ہے اور آخر فنا۔

ہر چیز کو فنا لازم ہے۔ فنا منزل ہے۔ فنا ہی حاصل ہے۔

اس روز جب پہلے پہل میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں تمہیں بڑی مدت سے تلاش کر رہا ہوں۔ اور گویا تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی میں تمہیں چاہتا تھا۔ میرا عشق ازلی ہے۔ نہ معلوم کب سے ۔ ایک لامحدود زمانہ سے۔ ایک بے حساب وقت سے تمہاری محبت مجھے قدرت نے روزِ ازل ہی عطا فرمائی تھی۔ تمہیں جاننے سے پہلے ہی میں ان مشکیں زُلفوں کو ان پیارے ہونٹوں کو پیار کرتا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں تمہیں دیکھ کر ہی میں تمہارا دلدادہ ہوا ہوں۔ لیکن وہ غلطی کرتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر ایک اضطراری کیفیت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ عشق! ——— وہ تو بہت پہلے سے تھا۔

اے محبوب! ازلی چیزیں ہمیشہ ابدی ہوتی ہیں۔ جب وقت کے تاثرات تمہارے چہرے، بالوں اور بدن سے ظاہر ہوں گے۔ جب گذرا ہوا زمانہ تمہاری من موہنی صورت کو صرف اخلاص اور تجربہ کاری میں تبدیل کر دے گا۔ تب کیا میرا عشق ختم ہو جائیگا۔ نہیں اے محبوب! میں تب بھی تمہیں اُسی جوش اور عقیدت سے چاہونگا میرا عشق نامعلوم زمانے سے ہے اور نامعلوم زمانے تک رہیگا۔ وہ ازلی ہے اس لئے یقینی وہ ابدی بھی ہے۔

جام ہے مگر خالی !
توپھر اُس سے کیا فائدہ ؟
ساقی اور میخوار کس لئے ؟
میخوار اور ساقی دونوں کی زندگی بے کیف۔
زندگی ہے ایک جام۔
اور ــــــ محبّت ہے ایک رنگین شراب۔
بغیر محبّت جسم اور زندگی سب بیکار ہے۔
محبّت اُسے قابلِ قبُول بناتی ہے۔

مصوّر نے ایک تصویر کھینچی۔ ایک عورت کی تصویر جس کے بال
سیاہ رات سے بھی زیادہ کالے تھے جس کے ہونٹوں پر اور گالوں
پر چمنستان کے پھولوں کی بہار کا رنگ کھل رہا تھا۔ آنکھوں سے
شراب ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ تصویر کیا تھی۔ شبابِ نوخیز کا مرقع تھی
اور حسنِ جہاں سوز کا مجسمہ۔

مصوّر نے مکمل تصویر کو دیکھا۔ دل میں خلش ہوئی ——
اُسے تصویر سے عشق ہو گیا تھا۔

ایک بیباک دوشیزہ نے اسے دیکھا۔

"اوہ! کیا تم اس بے جان تصویر پر ہی فدا ہو۔ دیکھو میرے
ہونٹ۔ گال اور بال ہاں سبھی اس تصویر کی مانند تو ہیں۔ بلکہ ان

گالوں میں گرمی اور ہونٹوں میں حلاوت ہے۔ جو اس بیجان تصویر میں نہیں۔ دیکھو اس بیجان تصویر کو پھینک دو۔ آؤ۔ میرے حسن کی پرستش اور میرے شباب کی قدر کرو۔"

"نہیں۔ نہیں مصوّر نے چلا کر کہا۔ تم نہیں سمجھیں۔ میں حسن چاہتا ہوں۔ جان نہیں۔"

حقیقتِ عشق

پروانہ دیوانۂ شمع کا شیدائی شوریدگی عشق میں جان دے دیتا ہے۔ نورِ حسن کا متوالا جلوۂ شمعِ درخشاں دیکھتے ہی بیقرار ہو جاتا ہے۔ تڑپتا ہے پھڑکتا ہے۔ صدقے ہوتا ہے اور نثار ہو جاتا ہے۔ سچ ہے۔ جب شمع تھی مگر روشن نہ تھی تب یہ مشہور سودائی کہاں تھا؟ جب ہوائے سحر کے ایک تیز جھونکے نے اس کی زندگی کا چراغ بجھا دیا تھا۔ تب اس کے رشتۂ حیات قطع ہونے پر اس جان دے دینے والے شیدائی نے کس ہمدردی و جانثاری کا اظہار کیا تھا؟

سوزِ عشق میں پہلے شمع نے جلنا شروع کیا کہ پروانے نے؟

دعوتِ وصل شمع نے دی کہ پروانے نے؟

سیلِ فراق شمع کی آنکھوں سے بہا کہ پروانے کی؟

غمِ عشق شمع نے برداشت کیا کہ پروانے نے ؟

خیالِ رسوائی شمع نے کیا کہ پروانے نے ؟

نازِ حُسن شمع سے نہ برداشت ہوسکا کہ پروانے سے ؟

ضبطِ غم شمع سے نہ ہوسکا کہ پروانے سے ؟

حقیقت یہ ہے کہ حُسن و جوانی خود عشق و شوریدہ سری کے مبتدی و منتہی ہوتے ہیں +

چاندنی رات کا پرکیف سماں تھا حُسن کی دیوی عشق کے دیوتا کے
دل کو پھانسنے کیلئے محبّت کا جال بن رہی تھی۔ وہ ندی کنارے دنیا ومافیہا
سے بے خبر ایک پتھر پر بیٹھی تھی شفّاف پانی میں اس کے حسین و دلکش
چہرے کا عکس پڑ رہا تھا۔ اور چاند کو شرما رہا تھا۔ فطرت نے اس
وقت حُسن کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دئے تھے۔ ایک آسمان پر تھا۔
اور تین زمین پر۔ دو پانی میں اور ایک ندی کنارے۔

حُسن کی دیوی کو یاد آرہا تھا۔ جب وہ غرورِ حسن میں فریبِ عشق کا
شکار ہوئی تھی۔ اس چاند اور ندی نے اس وقت اس کی آئینہ داری
کی تھی۔ اور اس کے خلاف ایک گہری سازش میں عشق کے دیوتا کی
سازگاری کی تھی۔ جب وہ دھوکے میں پریم کے اتھاہ ساگر

میں ڈھکیل دی گئی تھی۔

آج وہ اپنے بدلے کی فکر میں ہے۔ ایک سخت اور خوفناک انتقام کے خیال میں ہے۔ عشق اپنی کامیابی پر نازاں اور مست ہے۔ اپنے جوش اور زور کے سامنے کسی دل کی تڑپ اور شور کی پرواہ نہیں کرتا۔ آج وہ تمام کائنات کو حسن کا ایک زبردست جال بنا دیگی۔ ندی۔ سبزہ زار۔ بادل ہوا چاند ساری فضا کو اپنا شریک کار کرے گی اپنی طاقت کے زعم میں عشق کا دیوتا اندھوں کی طرح آگر اس جال میں پھنس جائیگا۔ وہی جس نے بے شمار حسین جوانیاں تباہ کر دی ہیں۔ اور لاتعداد دل توڑ دئے ہیں۔ آج اپنی ہار مان کر خود حسن کے گلے کا ہار بن جائیگا۔ آج سے اس کو کبھی کسی بھولے بھالے نادان دل کو اپنے فریب کا شکار کر کے مٹا ڈالنے کا موقعہ نہ دیا جائیگا۔

ناکام مُحبّت

چاندنی رات تھی۔ایک سیاہ سا دھبّہ بادلوں میں چاند کی طرف ہوا کی رفتار سے اُڑ رہا تھا۔ ایسے جیسے کوئی محبّت بھرا دل دعوتِ وصل پر محبُوب کی طرف دیوانہ وار کھنچا جا رہا ہو۔یہ دیوانہ چاند کی شمعِ روشن پر قربان ہونے پروانہ وار جا رہا تھا۔

بھولا جانباز یہ بھی نہ سمجھا کہ یہ خوبصورت کھلونا جس سے وہ کھیلنا چاہتا ہے۔اُس کی دسترس سے باہر ہے اور پہنچ سے بہُت دور۔

مجبوراً تھک کر وہیں گر پڑا بے بس اور بے قابو ہو کر اور سعیِ محبت میں چُور چُور۔صحرا کی ٹھنڈی ہوا نے سوزِ فراق کے مارے کو اسی دشتِ غربت میں ٹھنڈا کر دیا۔

محبّت کی ابدی نیند نے اُسے تھپک تھپک کر سُلا دیا۔

چاند سے بھی اپنا کُشتۂ ہجر رقصِ بسمل میں نہ دیکھا گیا۔ اُس نے مُنہ چھپا لیا۔ اور وہ آرام کی نیند سو گیا۔

اُس کی یاد میں۔

ہمیشہ کے لئے۔

کون؟

باوفا چکور۔

پھُول سے

اے پھُول۔

شاعر کا تخیّل تیری خوبصورتی تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک حسین کی مسکراہٹ تجھ میں ہے۔

تو آتشیں رُخ ہے۔

تیری آنکھوں میں شبنم کے آنسو ہیں۔

تیری خوشبو سے حور و غلماں وضو کرتے ہیں۔ تو تیز و تند ہوا۔ پانی کا ایک ہلکا چھینٹا۔ برداشت نہیں کر سکتا۔

تو نازک کلیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا ہے۔

کس قدر نازک ہے تو۔

میں! گناہوں سے بھرپور انسان اس قابل نہیں کہ تجھے چھُو سکوں ❊

دھوکا

میرے شانوں پر کیا بکھرا ہوا ہے؟ گالوں سے کون چیز چھو گئی ہے؟ نرم اور بل کھاتی ہوئی! اور اُف! یہ مشامِ روح پرور کہاں سے آئی؟ بالکل نتھنوں سے مُتصل کتنی تیز خوشبو ہے۔ دماغ مُعطّر ہو گیا۔ روح مست ہو گئی۔ مگر یہ کیا؟ لمبی لمبی! سیاہ! اتنی چمکدار! آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو گئی! یہ کیا ہے؟ ارے! یہ کیا ہے؟ ارے سانپ میرے تکئے پر سانپ! نہیں۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ مگر ابھی تو کچھ تھا۔ یہیں تھا۔ ابھی ابھی۔ بالکل میرے منہ کے پاس۔ میری آنکھوں کے سامنے تھی کوئی چیز ضرور۔ لمبی سی۔ کالی کالی۔ بل کھاتی ہوئی۔ نرم اور معطر۔ اسی تکیہ پر۔ دل اتنا تیز کیوں دھڑکنے لگا۔ سر میں سن سے یہ کیا ہو گیا؟ سارے جسم میں ایک برقی رَو سی دوڑ گئی ہے۔ اُف! اُف! اپنی ہڈیاں ٹوٹتے محسوس کر رہا ہوں۔

اُن کو کانوں سے سُن رہا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ دیکھو! وہ آگئے! یہ ہیں! یہ ہیں! میرے پاس ہیں! یہ دیکھو! یہ اُن کی ناگن زلفیں میرے تکیہ پر بل کھا رہی ہیں۔ میرے شانے پر بکھری ہوئی ہیں مشامِ روح کو معطر۔ دماغ اور دل کو باغ باغ کئے ہوئے آؤ پیارے گلے سے لگ جاؤ۔ سینے سے لپٹو۔ آنکھوں میں چھپو۔ دل میں سما جاؤ۔ دیکھو یہ سناٹا۔ یہ ڈراؤنی رات۔ سنسان اور وحشت ناک فضا۔ اس میں تم اپنے بیمار کو اپنے دیوانے کو کیوں چھوڑ گئے تھے؟ کہاں چلے گئے تھے؟ اور میں وحشت زدہ شوریدہ سر اگر اس تنہائی میں سر پٹک پٹک کر مرجاتا تمہیں دیکھو۔ انصاف سے کہو۔ اس سنسان ڈراؤنی رات میں تمہارا دیوانہ تمہارا بیمار تنہا بے کس بے بس سہم سہم کر کیسے نہ مرتا؟ تم خوب آئے۔ جلد آئے۔ وقت سے آئے۔ نہ آتے تو رات بھر تڑپتا۔ ڈرتا۔ گھبراتا۔ روتا۔ سر توڑتا۔ پیارے تمہارے سر کی قسم دم گھٹ جاتا۔ جو سانس بھی آتی چھریاں بن کر آتی دیکھو

ایسی ہولناک راتوں میں اپنے بیمار کو تنہا نہ چھوڑا کرو۔ ایسی راتیں بیمار پہ بڑی بھاری ہوتی ہیں۔ ان میں مریضِ ہجر بچتا ہی نہیں۔ یہ تمہاری ان کالی ناگنوں سے ان معطر و معنبر زلفوں سے زیادہ مہلک ہوتی ہیں۔ ایسا ڈستی ہیں کہ آدمی سوتا کا سوتا رہ جائے۔ سانس نہ ——— ایں!

کیا تم پھر چلے گئے۔ کیوں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ کہیں چھپ گئے؟ کیا خفا ہو گئے؟ رُوٹھ گئے؟ بولو۔ بولو کہاں چھپے ہو؟ آواز دو۔ بولو۔ پتہ دو تمہیں ڈھونڈوں۔ مناؤں بہلاؤں ہنساؤں۔ خوش کروں اپنے کلیجے سے لگاؤں۔ ارے کہاں گئے ہم کیوں گئے؟ کہاں ہو؟ چھپ رہے ہو۔ یہیں کہیں قریب ہی ہو۔ پیارے ایک آواز کا منتظر ہوں۔ ہمہ تن گوش بر آواز ہوں۔ بولو۔ پکارو۔ بتاؤ تم کہاں ہو؟ کیا یہ سب دھوکا تھا۔ تم آئے ہی نہ تھے۔ دھوکا تھا دھوکا۔ فریب طلسم تصور سحرِ تخیل۔ مایا۔ سراب۔ دہر ناپائدار کا نقشِ بے ثبات؟

عالم خیال

عالم خیال میں بیٹھا ہوں۔

چشمِ تصوّر میں ان کی متبسّم بھولی بھالی مسکراتی صورت چاند جیسا معصوم دمکتا چہرہ سامنے ہے۔آنکھوں میں کھُبا جارہا ہے۔

دل ہی دل میں رخِ روشن کی بلائیں لے رہا ہوں۔

آسمان پر چاند نکلا ہوا ہے۔مُورکھ چکور کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے چاند بدلی میں چھُپ چھُپ جاتا ہے۔چکور حیران ہے۔ اور میں

نہ کوئی مونس ——— نہ کوئی ہمدم

خیال ہے اک ——— پیا کا پیہم

سکوت میں ——— آسمان زمیں ہیں

پیا کہاں ہیں؟ ——— کہاں نہیں ہیں؟

وجہ انتظار

میں تمہارا انتظار کیوں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہاری راہ کیوں دیکھا کرتا ہوں۔ میں وہیں جا بیٹھتا ہوں۔ بہت دیر بعد تم نکلتی ہو۔ مجھے راستے میں بیٹھا پاتی ہو۔ تم سیدھی چلی جاتی ہو۔ میں تم سے بات نہیں کرتا۔ مبادا تم پر کوئی حرف آئے۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ پنگھٹ تک نہیں جاتا مبادا تم بدنام ہو جاؤ۔ لوگ تمہیں مشتبہ نگاہوں سے دیکھیں۔ میں وہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ تم دیر بعد واپس آتی ہو۔ سہیلیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی۔ مجھے وہیں بیٹھے پاتی ہو۔ ایکبار میری طرف دیکھتی ہو۔ آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ گردن نیچے جھکا لیتی ہو۔ ایک برقی رو میرے تمام بدن میں دوڑ جاتی ہے۔

ایک سنسناہٹ میرے جسم کو جھنجوڑ ڈالتی ہے۔

روز اسی طرح ہوتا ہے۔ مجھے بے خود کر کے تم صاف نکل جاتی ہو
اور تمہارے جانے کے بعد میں بھی واپس چلا آتا ہوں۔
میں کبھی نہیں رُکتا۔ میرے اور کتنے ہی کام رُکے رہتے ہیں۔
ایک نشہ ہے کہ چھُٹ نہیں سکتا۔ وقت ہوتا ہے اور میں وہیں
آبیٹھتا ہوں۔

ہاں تو میں تمہارا انتظار کیوں کرتا ہوں؟
مجھے تمہارے التفات کی ضرورت نہیں۔ میرے ہونٹ تمہارے
ہونٹوں میں جذب ہونا نہیں چاہتے۔ مجھے تمہاری خفگی کی پرواہ نہیں
مجھے تمہاری مہربانی کی طلب نہیں۔ پھر بھلا میں تمہارا انتظار کیوں
کیا کرتا ہوں؟

میں نے دُنیا بھر کے نشے کئے ہیں۔ انہوں نے مجھے کوئی تسکین
نہیں دی۔ ان سے میں کسی قدر وارفتہ ضرور ہو جاتا ہوں۔ لیکن
وہ میری تسلی نہ کر سکے۔ ابدی بیخودی اور دائمی وارفتگی کو میں نے

بہت ڈھونڈا اور اب میں نے اسے پالیا ہے۔ وہ مجھے تم سے حاصل ہوتی ہے۔ جب تم ہر روز آنکھیں چار کر کے گردن جھکا لیتی ہو اور خراماں خراماں چلی جاتی ہو۔

ہائے میں کیا بتاؤں میں تمہارا انتظار کیوں کیا کرتا ہوں۔

کیا تم نے کبھی سُنا؟

تم نے بھی کبھی سنا؟ اس گلی میں جب بالکل سنّاٹا ہو جاتا ہے۔ پرندے سوئے ہوتے ہیں یا چپ چاپ آرام کرتے ہیں۔ ہوا بند اور فضا خاموش ہوتی ہے۔ ایک خیال کی لاج مجھے اس گلی سے گزرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سر نہیں اٹھتا۔ نگاہیں زمین میں گڑی جاتی ہیں۔ پاؤں من من کے ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے اُس پار کبھی نہ پہنچ سکونگی لیکن اسقدر جلد یہ گلی ختم ہو جاتی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے اسمیں قدم رکھا ہی نہیں تھا۔ اس سنسان فضا میں اس ہُو کے عالم میں یا تو خاموشی ہی غضب کی ہوتی ہے، یا یہ دل دھڑکتا ہے بُری طرح سے میں نے تو اس کو زور زور سے دھڑکتے محسوس ہی نہیں کیا۔ بلکہ سنا ہے۔ کیا تم نے بھی کبھی سنا؟

پاؤں کی آہٹ

سیّارے مبہُوت اور مسحُور ہو کر ساکن ہو گئے تھے۔ ستارے حیرت سے زمین کی طرف تک رہے تھے۔ ندی خاموش تھی ہوا بند اور رات چپ تھی۔ ایک میں ہی نہیں عالم تمہارا منتظر تھا۔ دنیا تمہارے لئے چشم براہ تھی۔ آنکھوں کی نیند بالکل غائب ہو گئی تھی۔ اور نیند کی جگہ انتظار نے لے لی تھی۔ تمہیں کیا خبر تمہارے اشتیاق و انتظار نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا رات بھر بائیں جانب سے کچھ ایسی حرکت کچھ ایسی سرسراہٹ ہوتی رہی کہ میں سمجھتا رہا۔ کہ تم آ رہے ہو۔ کانوں میں پاس ہی کہیں سے کچھ ایسی آمد و رفت کی صاف آواز آ رہی تھی۔ کہ میں ہر لمحہ چونک اٹھتا تھا کہ شاید تم قریب آ گئے ہو کبھی دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی اور کبھی تمہارے پاؤں کی آہٹ۔ ہر سانس تمہارے

پاؤں کی آہٹ سے ملتا ہوا تھا۔

فتنۂ محشر خرام۔ بجلی کی تڑپ۔ستّاروں کی مستانہ رفتار۔ چاند کا پردۂ سیماب میں حجاب۔ بادلوں کی سبک خرامی۔ چکور کا مستانہ رقص نشہ رگ کی حرکت اور دل کی بیقراری کیا تیرے خرام ناز کی ممنون نہیں ؟

دل کے کعبے میں بسنے والے۔ ہردے کے مندر میں رہنے والے میرے منتظر اور پریشاں دل کو مسلنے اور کچلنے والے یہ دل اتنا دھڑکتا کیوں ہے ؟

اس سنّاٹے کے عالم میں اس سنسان فضا میں اس کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

اے میرے دل میں بسنے والے! کہیں یہ تیرے قدموں کی آہسٹ تو نہیں ؟ ❖

محبّت کی خوشبو

میں نے دیکھا وہ آئے ہیں۔ ایک پھول ان کے ہاتھ میں ہے۔ میرے سامنے رکھ کر کہتے ہیں "جب اس پھول کی بہار آتی ہے اور میرے حضور میں اس کے پیش ہونے کا وقت آتا ہے تو یہ بیوقوف اپنے آپ کو زمین پر گرا دیتا ہے پنکھڑیاں بکھر جاتی ہیں۔ خوشبو ختم ہو جاتی ہے اور خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے۔"

میں لرز جاتا ہوں۔ سارے جسم میں ایک سنسنی پیدا ہو جاتی ہے جسم کی ساری حرکت سمٹ کر دل میں جمع ہو جاتی ہے۔ اور سارا خون پانی بن کر آنکھوں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔

وہ کہتے ہیں "اسی طرح ایک روز تمہاری زندگی کی بھی بہار ہو گی۔ تمہارے لئے بھی میرے حضور میں پیش ہونے کا وقت آئیگا

اور تمہیں بھی اسی طرح خاک میں مل کر خاک ہو جانا ہوگا"۔

میں کانپ اُٹھتا ہوں اور میرے جسم میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ دل اُسی پھول کی طرح کھل گیا ہے۔ میری آنکھوں سے جذبات کا ایک طوفان اُمڈ پڑا ہے۔

وہ کہتے ہیں "تم بھی اس پھول کی طرح اپنے دل میں محبت کی خوشبو پیدا کرو۔ تاکہ جب میرے حضور میں تمہارے پیش ہونے کا وقت آئے تو اس سے زیادہ عجز و نیاز کے ساتھ پذیرائی کے لئے پیش ہو سکو"۔

کیوپڈ ــــــــ محبّت کا دیوتا ۔مستِ شباب ۔شرارت پر آمادہ

اور اندھا!!

سر سے پیر تک پھولوں سے لدا ہوا ۔

ہاتھوں میں تیر کمان لئے ۔

چمن میں پھولوں سے کھیل رہا تھا ۔

گلاب کے پھولوں پر ہاتھ مارا ۔ اندھا بیچارہ کانٹے کو دیکھ نہ سکا ۔انگلی میں خلش سی ہوئی ۔

بولا ۔"اوہ! کیا میرے تیروں سے دلوں میں ایسی ہی چبھن ہوتی ہے ؟" ٭

"دیوتا دیوتا سب برابر ہیں" کسی نے کہا۔

"نہیں" عشق کا دیوتا بول اُٹھا۔

"میں طوفان برپا کرتا ہوں۔ آگ لگاتا ہوں۔ آندھی چلاتا ہوں۔ مارتا ہوں۔ جلاتا ہوں۔ ازل سے انسان کو ہلاک کرتا رہا ہوں۔ ابد تک اُن کو خانماں برباد کرتا رہونگا۔ میں دلوں کو مٹا دیتا ہوں رُوحوں کو پیس دیتا ہوں"

آواز آئی "سارے دیوتا ایسا کر سکتے ہیں۔ حسن کی دیوی تو خود تجھے دیوانہ بنا دیتی ہے"

دیوتا بولا "مگر یہ سب ظلم اور زیادتی کے زور میں کر سکتے ہیں۔ قوت اور ہیبت کو کام میں لاکر سکتے ہیں۔ جبر اور زبردستی کے ساتھ کر

سکتے ہیں۔ اُنکا تیر خُونی ہے۔ چُبھنے والا اور تکلیف دہ ہیں یہ
سب لطف سے کرتا ہوں۔ محبت اور پیار کے ساتھ پیش کرتا ہوں
میرے زہر میں تریاق ہے۔ میرے درد میں مزہ ہے۔ میرے دُکھ
میں سُکھ ہے۔ اور دیوتاؤں کے پاس جور و ظلم کا خوفناک حربہ ہے
تکلیف دہ اور قابل نفرت۔ مگر میرے پاس محبّت کا دل نشین
تیر ہے +

اے دلربا!

امیدیں اور ان پر آنسوؤں کی اوس۔

گلاب کی خوشنما پتیاں اور ان پر اوس کی بوندیں۔

مگر ان میں کس قدر فرق ہے؟

آتشِ گُل اور بھڑک اٹھتی ہے اوس سے۔ لیکن بیچارہ عاشق اس اوس سے بُجھ کر رہ جاتا ہے۔

اور پھر بھی گلاب عاشق نامراد کی قبر پر چڑھائے جاتے ہیں۔

اے شاعر

اے شاعر!

تو اپنے حُسنِ بیان سے کانٹوں کی دُنیا کو پھولوں کی دنیا بنا دیتا ہے۔ دشوار گزار راستوں کو پھولوں سے پٹی ہوئی چمن کی روش خیال کرتا ہے۔

دریا کی خوفناک لہروں کو ایک مدہوش حسینہ کی بل کھائی ہوئی زلفوں سے تشبیہ دیتا ہے تجھے مُصیبتیں نہیں ڈراتیں تجھے کوئی چیز خوف نہیں دیتی۔

مگر اے شاعر۔ تو چاندنی راتوں میں بے چین کیوں ہو جاتا ہے۔ اُس وقت تیرے اس حسن بیان کی پیش کیوں نہیں جاتی؟

پاگل

پاگل۔ تم کیسے جیت سکو گے؟

میں حیران ہوں۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔ پاگل تم کیسے جیت سکو گے؟ محبت؟ اور اس میں اثر؟ کیا تم نہیں دیکھتے چکور کو چاند سے محبّت ہے اور چاند پر اسکا اثر؟

شمع اور پروانے ایک دوسرے کے دیوانے ہیں۔ وہ اس کے دست و پائے ہوس کے شکست پر روتی ہے اور وہ اس کے ثبات قدم بے وفائی سے جل کر اور شکست طلسم فریب حسن و عشق سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ مگر نتیجہ اور انجام۔ کیا کبھی دنیائے حسن و عشق میں جان کی بازی لگانے پر بھی کسی کی جیت ہوئی ہے۔

لیکن پاگل ہاں وہ دیوانہ میری باتیں ایک عجیب شان استغنا کے ساتھ سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

آخر اُس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ محبت بارجیت سے بالا تر ہے۔ اور وہ خود مجھے انتہائی حیرت میں چھوڑ کر وہاں سے چلدیا

اُس کی دیوانگی عقل و دانائی سے بہت زیادہ بلند تھی۔ میرے فلسفہ کج فہم کی اتنی رسائی نہیں ہو سکتی۔ نہ جانے کتنی دیر میں وہیں خاموش کھڑا شائد یہی سوچتا رہا۔

اے مغنیہ

اے مغنیہ!

تیرے پاس کوئی بربط نہیں۔

تجھے گاتا ہوا کوئی نہیں دیکھتا۔

پھر بھی میں جانتا ہوں کہ تو مشغول نغمہ ہے۔ اور تیرے گیت کو میری روح سن رہی ہے۔

تیرے اس راگ نے مجھے مدہوش اور بے خبر بنا دیا ہے۔

اے مطربہ! بجا۔ اپنے طرح طرح کی رنگینیوں سے لبریز ساز کو بند نہ کر۔ بند نہ کر شرابِ نغمہ پلائے جا۔

اپنا ہاتھ نہ کھینچ۔ بجائے جا۔ اے مطربہ! اپنا ساز بند نہ کر۔

وہ سو رہی ہے اُسے سونے دے۔ یہ مسحورکُن نغمے اس کی روح پر حاوی ہو کر اُسے موسیقی کی دنیا کی سیر کرا رہے ہیں۔

کرنے دے۔ اُسے سیر کرنے دے۔

اے مطربہ بجا۔ اپنے ساز کو بند نہ کر۔

میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ حسین ہے؟

میں نہیں جانتا وُہ کیسی ہے۔ ہاں اتنا معلوم ہے۔ کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔

بجا۔ تاکہ وہ جاگ نہ جائے۔ اور میں اُسے جی بھر کر دیکھ سکوں
اور دیکھتا رہوں کہ اُس کا حُسن جانسوز ہونے کی بجائے چاندکی
روشنی کیطرح روح پرور ہے ۔

ا ۔ مطربہ

سازِ دل

اے مطربہ! تیرے ساز سے نکلنے والے نغمے کی طرف میں کھچی جارہی ہوں اس میں ایک کشش نہاں ہے۔

مطربہ ٹھہر۔ ایک لمحہ کے لئے اپنے ساز کے تاروں کو بے حس و حرکت کر۔ تاکہ مجھے بھی قرار ہو۔

اے مطربہ! کیا تیرا ساز میرے دل کا ساز نہیں؟

مطربہ ٹھہر مت۔ میں غلطی کرتی ہوں۔

بجائے جا۔ اے مطربہ۔ بجائے جا۔

میرا دل اور تیرا ساز یقیناً ایک ہیں۔

دل کے قرار میں وہ لطف کہاں۔ جو میں اب پاتی ہوں۔

کون جانتا ہے

بچہ خواب میں مسکرا رہا ہے۔

جس طرح پورنما کا چاند مسکراتا ہے۔ جیسے غُنچے مسکراتے ہیں کلیاں چٹکتی ہیں۔ پھُول کھلتے ہیں۔ تارے نکلتے ہیں۔ اندھیرے میں اُجالا ہوتا ہے۔

ہنسنے دو۔ ہنسنے دو۔ مسکرانے دو۔

یہ تبسّم خبر نہیں زندگی کی بے ثباتی پر ہے۔ حیاتِ عارضی کی چند روزہ گی پر ہے۔

حیاتِ لازوال کی امید میں ہے ابدالآباد کی یاد میں ہے، یا کیوں ہے کسے خبر یہ ہنسی کتنے دن کی ہے۔

کون جانتا ہے کہ کل اُسکے مقدّر میں کتنے آنسو بہانے لکھے ہیں۔

موجیں لبِ ساحل سے سر ٹکراتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔
کیا زندگی کا بھی انجام ہے ؟

اس دنیا کے صحرا میں مصائب کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں ہمارا قافلہ ایک نامعلوم منزل کی طرف دوڑ رہا ہے۔

لوگ آتے ہیں گزرتے جاتے ہیں کیا اسی کا نام زندگی ہے؟

میں پیتا ہوں

ہاں میں پیتا ہوں - اور خوب پیتا ہوں -

دن رات سوتے جاگتے خلوت میں اور سب کے سامنے دل کھول کر پیتا ہوں - شرط باندھ کر پیتا ہوں - خفیہ نہیں علانیہ پیتا ہوں - بے شرم نہیں مگر بے حجاب ہو کر پیتا ہوں - حریف ریا کار کے سامنے ڈھٹائی سے پیتا ہوں سخی ساقی کی نظر بچا کر شرمسار نادم اور خوفزدہ رہ کر پیتا ہوں - رندوں کو شریک کر کے پیتا ہوں - اور حرماں نصیب کو ترسا ترسا کر دور سے دکھا دکھا کر پیتا ہوں - میں دھاوت پینے والا ہوں - ہمیشہ سرشار رہتا ہوں - اتنی پیتا ہوں کہ لوگ مجھے مست وسیاہ مست کہتے ہیں - اتنی پیتا ہوں کہ شقاوتِ قلبی اس میں ڈوب جائے - اتنی پیتا ہوں - کہ بھلے بُرے کی تمیز نہ رہے - اتنی پیتا ہوں

کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہے۔

لوگ اشارے کرتے ہیں۔ چپکے چپکے کہتے ہیں چپ چپ ہوتے ہوئے ہوتے ہے۔ کوئی رحم کھاتا ہے۔ کوئی نفرت کرتا ہے۔ کوئی ہمدردی کے جوش میں سمجھاتا ہے۔ اور نصیحت کرتا ہے۔ میں ہنستا ہوں۔ ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوں اور پھر پیتا ہوں۔

میں پیتا ہوں اور خوب پیتا ہوں۔

کون کہتا ہے کہ اس سے مجھے معرفت حاصل نہیں۔ میری اصلاح اخلاق و حیات نہیں عشق حسن و فطرت و کائنات نہیں فکر ادائے فرض نہیں۔ خوف باز پرس و جزا نہیں۔ جب یہ سب مجھے اس کی بدولت حاصل ہیں تو کیوں نہ پیوں۔ ہر وقت کیوں نہ پیوں۔ خوب سیر ہو کر کیوں نہ پیوں؟

میں پیتا ہوں اور خوب پیتا ہوں۔

میں پیتا ہوں۔ غم غلط کرنے کے لئے ——— نہیں۔

ذائقہ کے لئے؟ —— نہیں۔

عیش وعشرت کے لئے؟ —— نہیں۔

اظہار وتصنّع کے لئے؟ —— نہیں۔

پھر میں کیوں پیتا ہوں؟ —— اپنی مغفرت کے لئے

ہاں میں پیتا ہوں۔ اور خوب پیتا ہوں ؂

جوانی یا قیامت۔ آفت۔ مصیبت۔ ولولے۔ جوش۔ امنگیں۔ حسرتیں
آرزوئیں۔ تمنائیں۔ مُرادیں۔ حوصلے جُستجو اور تلاش۔
ایک ہنگامۂ محشر۔ طوفانِ قیامت۔ کہیں چین نہیں کبھی قرار نہیں۔
اور ناکامیٔ محبت کے ایک تیر سے یہ تمام طوفان ایک بلبلے کی
طرح زندگی کے وسیع سمندر میں بیٹھ گیا!۔

بس! یہی تھی کائناتِ جوانی۔ انجامِ حسن و عشق و حیات؟

آنکھ، دل، دماغ

مد بھری نین کیسی جادو اثر ہوتی ہے! لوگ اسے نرگس سے تشبیہ دیتے ہیں چشم آہو کے مثل بتاتے ہیں۔ اور شاعروں نے تو نہ جانے اس کے کیا کیا نام رکھ چھوڑے ہیں۔

میں کہتا ہوں وہ ایک لینز (LENS) ہے ویسا ہی جیسا فوٹو کے کیمرے میں ہوتا ہے۔

ہمارے دل کو لوگ زخمی اور مضطرب بتاتے ہیں۔ شاعر اُسے شیشہ جیسا نازک کہتے ہیں۔ اور آئینہ جیسا شفاف۔ مگر میں کہتا ہوں اس پر کسی قسم کا مسالہ لگا ہوا ہے۔ ایسا ہے جیسا کہ فوٹو کی پلیٹ پر لگا ہوتا ہے۔

اسی دل کے کسی گوشے میں اس سائیں کا مندر ہے۔ اور اُس پریتم

کا گھر جس کو دُنیا والے ہزاروں لاکھوں ناموں سے یاد کرتے ہیں
اور طرح طرح کی تصویروں کا تصوّر باندھتے ہیں۔
اور سنا؛ میں کہتا ہوں یہ مندر اور یہ گھر پریتم کا سٹوڈیو
(نگار خانہ) ہے اور وہ خود فوٹوگرافر ہیں۔
اور اس دل کی سنسٹو پلیٹ (SENSITIVE PLATE)
پر تصویریں بھی پریتم ہی کی کھینچتی ہیں۔ وہ کیسے ؟
سائیں کے تیوروں کا عکس دل پر پڑ رہا ہے پھول اولا محبوب
قوس قزح طاؤس ایک نہیں تمام فضائے رنگ و بو اُن کے حسنِ اتم
کا عکس ہیں۔ اور اس عکس کا عکس دل پر منعکس ہے۔ دنیا میں
کوئی نیک کام کیا جا رہا ہے۔ وہ سائیں ہی کی نیکی کا پرتو ہے۔
کوئی خوبی اور خوبصورتی سماج میں جلوہ افگن ہے۔ وہ ان ہی کے
حسنِ کامل کی ضیا پاشی ہے۔ کسی احسان و ہمدردی نے ہمارے
دل کو نیت و خلوص سے بھر دیا ہے۔ وہ پریتم ہی کے محبت و کرم

کا نمونہ ہیں۔

دیکھا۔ دِل کے فوٹو پلیٹ پر ہر بار کس کے رُخ انور کا عکس پڑتا ہے اور کس کی تصویر کھنچتی ہے۔

اس فوٹو کی پلیٹ پر ایک جھلّی سی چڑھی رہتی ہے یہ پردہ بصیرت ہے۔ یہ ویسا ہی ڈھکن ہے جیسا فوٹو کیمرے کی پلیٹ پر چڑھا رہتا ہے۔ پر ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس جھلی اس پردے اور اس ڈھکن کو گرد و غبار سے پاک صاف رکھیں ورنہ وہ بڑے تنک مزاج فوٹو گرافر ہیں جہاں دیکھا کہ یہ جھلی گرد و غبار سے کثیف و میلی ہونے لگی انہوں نے تصویریں کھینچنا کم کر دیا۔ اب جتنا یہ پردہ آلودۂ کثافت اور سیاہ ہوتا جاتا ہے نورِ ایمان کی روشنی دل کی سنسٹو پلیٹ پر مدھم پڑتی ہے۔

اس پردے کو صاف شفاف اور اجلا چٹا کرنے کے لئے سن لائٹ سوپ (SUN LIGHT SOAP) کی بجائے فلیتھ لائٹ سوپ

(FAITH LIGHT SOAP) کی ضرورت ہے ۔ اور شقاوت قلبی کے ہارڈ واٹر (HARD WATER) کی بجائے عقیدت وخلوص اور ضمیر واعتقاد کے سوفٹ واٹر (SOFT WATER) کو استعمال کرنا پڑتا ہے ۔ اور تبھی ایک ایسا لوشن تیار ہوتا ہے جس سے دل کی فوٹو پلیٹ دھل کر تصویر تیار ہو جاتی ہے ۔

نور ایمان کی شعاعیں جب اپنی دلسوز تڑپ اور حسرت کے ساتھ دل پر لپٹے ہوئے مسالے پر پڑتی ہیں ۔ تب اس میں سے ایک غاز (GAS) سی پیدا ہو کر اوپر کی طرف اٹھتی ہے ۔ یہ جذبات وخیالات کی گھٹا دماغ سے ٹکرا کر جہاں فلسفہ و منطق وحکمت کی برودت رہتی ہے عمل تکاثف جیسی تبدیلی اختیار کر لیتی ہیں اور پانی کی صورت میں بہہ نکلتی ہیں ۔

آنسو کھاری کیوں ہیں ؟ کیا اس لئے کہ فوٹو پلیٹ دھونے کا لوشن بھی مسالہ ملا ہوا تھوڑا سا کھاری ہوتا ہے ۔ ان سے ہمارے

پردہ ہائے بصیرت و بصارت دو تو خوب دُھلتے ہیں۔ اور پریتم کی
تصویریں بھی دھل کر نکھری نکھرائی صاف شفاف نکل آئی ہیں۔ اور
ان کی یاد ترو تازہ ہو جاتی ہے ٭

محبّت کی زندگی

محبّت کا معصُوم بچپن بڑھاپے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس کی رندجوانی عدم کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا پختہ کار بڑھاپا محبت اور محبوب دونوں کی فنا کے بعد ۔

انجام محبّت

یاس محبّت کی اُمید کا نام ہے۔
ناکامی محبت کی سعی کا کام ہے۔
مگر بقائے دوام محبت کا انجام ہے ۔

اے محبوب میرے! آؤ۔

میری زندگی شبنم کے قطرے کی مانند عارضی ہے۔

محبوب جلد چلے آؤ۔

آؤ کہ تم میری زندگی کے ہر لمحے میں شبنم سے زیادہ مسکراہٹ پیدا کر سکتے ہو۔

اے محبوب آؤ۔ جلد چلے آؤ۔

کیوں؟

قدیم خیال یہ ہے کہ آفتاب گردش کرتا ہے۔ جدید تحقیق یہ ہے کہ زمین گردش کرتی ہے پہلے کہتے تھے صرف آسمان گردش کرتا ہے۔ اب کہتے ہیں آسمان زمین سورج چاند تارے سبھی گردش کرتے ہیں۔ مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ مسلسل گردش کیوں ہے اور اس پیہم چکر کی غرض و غائیت کیا ہے۔

مرکز و دائرے میں تعلق اصرار و انکار میں تکرار ناز و نیاز میں جھگڑا اور حسن و عشق میں پیکار کیوں ہے؟

موت کو جوانی سے اور افلاس کو حاجت سے اور ناقدری کو ہنر سے اتنا زیادہ لگاؤ کیوں ہے؟

بُلبُل پھول پر چہک رہی ہے۔ بھونرا کلیوں پر منڈلا رہا ہے۔ تتلی

رنگ و بو کے پیچھے اُڑی پھرتی ہے۔ قمری سرو پر فدا ہے جنگل میں
طاؤس رقص کر رہا ہے۔ چکور چاند کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ مجنوں
گریبان تار تار کیے غزالانِ دشت کے پیچھے پھر رہا ہے۔ بزم میں پروانے
شمع پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور ہم ..... ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ
کیوں ہے۔

شبنم آفتاب سے چاند سحاب سے بُلبُل گلاب سے پروانہ شمع سے
اور عشق حسن سے صرف ایک التہاب کے متحمل کیوں ہیں۔ اور اس
کے بعد اس تمام جذب کا انجام آخر کیا ہے؟

ابتدا و انتہا کی خبر نہیں۔ آغاز و انجام سے غرض نہیں ایک وسیع
اور عظیم الشان مشین ہے جس کو پوری کوک بھر کر چلا دیا ہے اور
اب اُس کا پُرزہ پُرزہ پوری مستعدی کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔

روح کی پیاس

تم کیا تلاش کرتے ہو؟
کیا تم عیش چاہتے ہو؟ کیا خوشی ڈھونڈتے ہو؟ کیا تمہیں مسرت کی تلاش ہے؟
بھلا تم جانتے ہو۔ خوشی ہے کیا؟
راحت کہتے کسے ہیں؟ مسرت کیا ہوتی ہے؟
بھلا اس سعیِ لا حاصل میں تم کبھی کامیاب بھی ہوئے؟
تم کیا ساری دنیا میں کبھی اور کوئی بھی آغوشِ مسرت سے ہمکنار ہُوا ہے؟
جاہل! مستقل سکون و راحت اور دائمی مسرت کو نہ ڈھونڈ۔
یہ تیری سخت غلطی ہے۔ بڑی بھاری بھول ہے۔

اس نعمتِ بے بہا کا اگر وجود ہے تو وہ اس جہان میں تو ہرگز نہیں۔

ہاں اپنی آنکھیں بند کر اور دل کی دنیا میں پیکرِ محبت کو تخت نشین کر۔ اس مندر میں اُس نُور کے جاہ و جلال سے تیری رُوح کی پیاس بُجھ سکتی ہے۔

سازِ زندگی

زندگی بے مزہ ہے۔ کسی قسم کا لطف نہیں۔ طرح طرح کی مصیبتیں انسان کو خونخوار اژدہے کی مانند گھیرے ہوئے ہیں۔

رنجدہ خیالات دماغ کو اور پراگندہ کرتے ہیں۔

مگر اے انسان تو بھول کیوں جاتا ہے۔ کہ خدا نے کچھ بھی تو بیکار نہیں بنایا۔ اگر تیرے دِل میں نغمہ انبساط نہیں تو نہ سہی۔ نوحۂ غم تو ہے۔ اسی کو غنیمت جان۔ کیونکہ یہ سازِ ہستی کبھی بجتے بجتے یک لخت ٹھہر جائے گا۔ اور پھر یہ نوحۂ غم بھی سنائی نہ دیگا۔ وقت کا بہترین استعمال کر اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نوحۂ غم ترانۂ حیات نہ بن جائے۔ یہ کیسے؟

تو خود ہی غور کر۔ جلد تیری سمجھ میں آ جائے گا۔

اندھے

تم بصیرت نہیں رکھتے۔

تمہاری دنیا بالکل محدود ہے۔

تم محسوس کر سکتے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے۔

تمہیں سورج۔ چاند۔ تارے بہتے ہوئے دریا۔ گرتے ہوئے آبشار نہیں دکھائی دیتے۔ تمہاری دنیا تاریک ہے۔

——— "پاگل ہو تم۔ خدا نے مجھے حقیقت سے آشنا کیا ہے میں وہ دیکھتا ہوں جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ تاریکی کے پسِ پردہ ایک دریائے نور موجیں مار رہا ہے"۔

خزاں کے بعد بہار

اے میرے بھولنے والے۔
تم نے مجھے بھلا دیا۔
لیکن مجھے امید ہے کہ تم ایکبار ضرور میرے پاس آؤ گے۔
اسی بہار کی طرح جو چلی جاتی ہے۔ باغ خزاں کے حوالے ہوجاتا ہے۔ روشوں پر خاک اُڑتی ہے لیکن بہار پھر آتی ہے۔ شادمانی کا دور دورہ ہوتا ہے —— میرے چمن میں بھی بہار آئے گی۔
اے میرے بھولنے والے۔
تم نے مجھے بھُلا دیا۔
لیکن کیا اندھیری رات کے بعد روشن صبح نمودار نہ ہوگی؟

رشتۂ الفت

صُبح ہونے کو ہے۔ تاروں کی محفل برخاست ہو رہی ہے۔ وُہ سب باری باری آسمان کے نیلگوں شامیانے کے نیچے سے کھسک رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کے زور سے پودے ہم آغوش ہو ہو کر جُدا ہو رہے ہیں۔ چروا ہے مویشیوں کو لئے کھیتوں کی طرف جا رہے ہیں۔ چوکیدار کی آواز مدھم ہوتی ہوئی فضا میں گم ہو گئی ہے۔

لیکن میں اور بیابان کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتے۔ ہم ایک نامعلوم رشتۂ الفت میں منسلک ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ دُنیا کے شور و شر سے بہت دور کسی خاموش ندی کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں ایک کنجِ عافیت ہو۔ مگر جب ندی کے پانی کا میٹھا اور مدھم نغمہ اور درختوں کے کُنج کا خاموش گیت جاں پرور ہوں۔ تو اس وقت اے سائیں۔ تو اپنی باوفا رفاقت اور وجود کے راگ کو بھی روح نواز کر۔

کہاں سے

رات میں میری پلکیں نیند سے بھاری ہو جاتی ہیں۔ میں یہ سوچتا ہوا سو جاتا ہوں کہ آنکھوں میں نیند کہاں سے آکر جمع ہو جاتی ہے اور خواب کس طرح دکھائی دیتے ہیں۔ میں رات میں اکثر سوتے سوتے چونک اُٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ چاندنی رات میں ایسی وجدانی کیفیت کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ اور صُبح سویرے جب فضا دلکش نغموں سے معمور ہوتی ہے۔ تو میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ تخیلِ شاعری کے اس بے پناہ سیلاب کا مبدا کیا ہے۔

میں کئی دفعہ یہ سوچ کر بے چین ہو گیا کہ بلبل کے نغمے کبھی حزن وملال سے خالی کیوں نہیں ہوتے۔

اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ حسنِ معصوم پر لازمی طور پر پیار

کیوں آتا ہے۔ اور غنچہ کے ہونٹوں پر کھیلنے کیلئے معصوم مسکراہٹ کہاں سے آتی ہے۔

مگر پھر دل کے کانوں میں آواز آتی ہے کہ دیوانے تو یہ فکر کر کہ تیرے دل میں دردِ محبت کی ابتدا کیسے ہوتی ہے ✦

سعیٔ لاحاصل

چاندنی کتنی بھی دلفریب اور جانفروز کیوں نہ ہو۔ کیا تم اُسے اکٹھا کر لو گے؟

نغمہ آبشار کتنا ہی دلکش اور روح افزا کیوں نہ ہو۔ کون اُسے بند کر کے رکھ سکتا ہے؟

زندگی میں ہم بہت سی ایسی کوششیں کرتے ہیں جو ہماری طاقت سے باہر ہیں۔

اے محبوب! تجھے نہ پاکر میں افسردہ ہو جاتا ہوں۔
میرے جیسا پاگل کون ہوگا۔ جو نور کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

اے محبوب میرے۔ تیرا جسم وہ نور ہے جس کو صرف دل

کی ہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔

تیرے قدموں کی خاک صرف روح ہی کے لئے ہے۔

ہاں میرے محبوب۔میں تمہیں پکڑنے کی ناحق کوشش کرتا

ہوں ۔

واپس کیوں نہیں آتے؟

اے دوست ۔

جہاں تم ہو وہاں کس دلچسپی نے تمہارا دامن تھام رکھا ہے۔ کہ تم واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے ۔

جس طرح سیاہ بادلوں کے پیچھے چاند کا منوّر چہرہ ہے جسطرح ہر تاریک رات کے بعد آسمان پر خوبصورت نورانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے بالکل اُسی طرح اس دنیا کے پیچھے ایک اور نورانی دنیا ہے ۔

جہاں تم ہو۔

مگر ہاں ۔ وہاں کس دلچسپی نے تمہارا دامن تھام رکھا ہے کہ تم واپس ہی نہیں آتے۔

جب شام ہو جاتی ہے ۔

تاریکی کے ساتھ ساتھ ندی کا پانی اور زور سے لہریں لینے لگتا ہے۔ طوفان آتے ہیں کشتیاں غرق اور پاش پاش ہو جاتی ہیں مگر کبھی کبھی اس تاریکی اور بربادی کے دوران میں ندی کے دوسرے کنارے سے بجلی بھی کوند جاتی ہے جس کی عارضی روشنی اکثر سلامتی کا باعث ہوتی ہے۔ اس طوفان کے شور میں بارہا دُور سے ایسی آواز بھی آتی ہے۔ جیسے ہزارہا نغمے اکٹھے ملے ہوئے ہوں۔

اے دوست کیا یہ آواز اور یہ روشنی اُسی دُنیا کی ہے جہاں تم ہو۔

اے دوست وہاں تمہارا دامن کس دلچسپی نے تھام رکھا ہے کہ تم واپس ہی نہیں آتے ٭

شام

شام ہو رہی ہے۔

آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف اُڑ رہے ہیں۔ جانور جنگلوں سے گاؤں کی طرف اپنے اپنے مالکوں کے مکانوں کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ کسان اپنے اپنے ہل اور بیلوں کی جوڑیاں ہانکتے اپنے گھر پلٹ چکے ہیں۔ کاروباری لوگ اپنے اپنے دن بھر کے کام ختم کر کے اپنے رات کے آرام کے لئے اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف چل کھڑے ہوئے ہیں۔

دن بھر کے سفر کا مارا تھکا ماندہ مسافر اب اپنی منزل کے قریب ہے۔ وہ دیکھو ایک غریب بڑھیا اپنے جھونپڑے میں چراغ روشن کر رہی ہے۔ اے لو۔ ہوا کا وہ ایک جھونکا آیا۔ بڑھیا کا چراغ
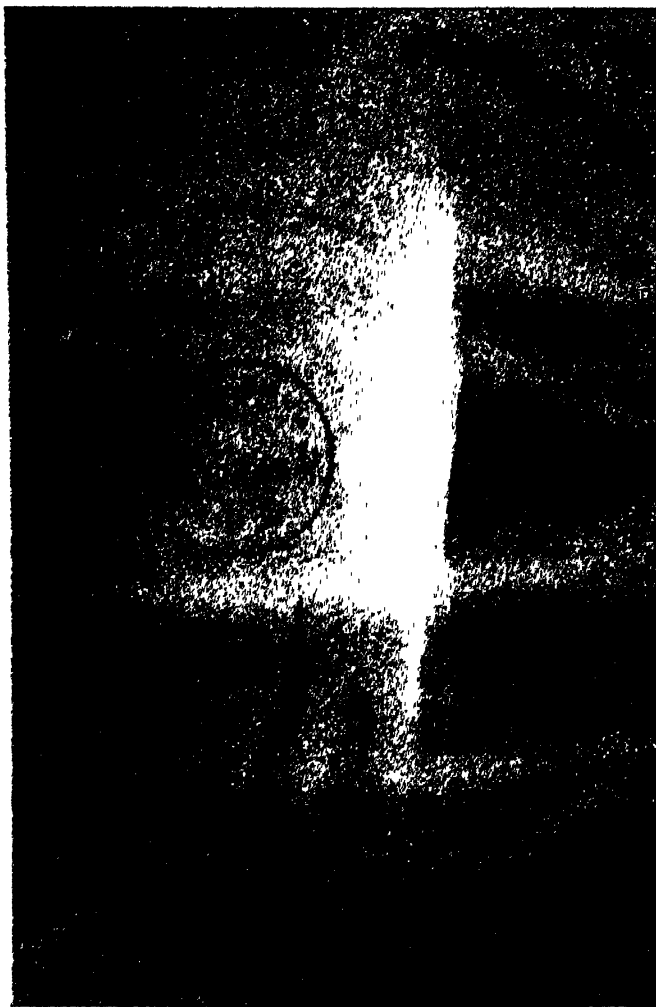
بجھ گیا۔

مالک میرے! میری زندگی کا سفر بھی ختم ہونے کو ہے۔ میں بھی اب اپنے گھر واپس آنا چاہتا ہوں۔ اپنے مالک کے پاس۔ میرا آشیانہ بھی کہیں وہیں ہے مالک۔ تیرے چرنوں میں۔ تیرے قدموں کے آس پاس۔ یہ میری وحشی روح جنگل صحرا بیابان نہ معلوم کہاں کہاں بھٹکتی ماری ماری پھری۔ میں اپنا کشتِ عمل بو چکا۔ جیسا بویا ویسا کاٹا۔ میرے نفس کے بیل بڑی کڈھب راہ چلے۔ ان کمبخت ہاتھوں نے گناہ کے بیج بوئے۔ پاپ کا ہل چلایا نافرمانی کے پھل اگائے۔ اب اس زہر کو چکھتا ہوں۔ ساری عمر کی محنت اکارت ہوئی۔ زندگی ضائع ہوئی۔

مالک، ضمیر مر گیا ہے۔ روح سو گئی ہے اب تو مجھے اپنے گھر واپس جانے دے۔ اپنے وطن مراجعت کرنے کی اجازت دے اپنے پاس بلا لے۔

زندگی کا دن بیت گیا۔ عمر گذر گئی لوبھ اور لالچ کے پھندوں میں جکڑا ہوا۔ میں پاپی انسان گنہگار۔ بندۂ خاطی غلام نافرمان حیوان شیطان ابھی اور جینے کے منصوبے گانٹھ رہا ہوں۔ بڑے بڑے محل کھڑے کئے ہیں۔ بڑے بڑے بیوپاروں میں اپنی جان لڑائے ہوئے ہوں۔ زندگی کا کھیل ہار گیا۔

ہار گیا اس جوئے میں اپنی جان اپنے روح کی بازیاں لگا کر بھی ہار گیا۔

اور اب۔ مالک۔ اب میں اپنی اصلی قیام گاہ کی طرف چل دینا چاہتا ہوں۔

کیا تیرے وسیع عدم آباد میں ایک گم کردہ راہ مسافر کے لئے کوئی فرودگاہ کوئی منزل کوئی قیام گاہ نہیں ؟

مالک تیرے دین سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں مجھ ناکارہ غریب بوڑھے نے آس کا ایک چھوٹا سا دیا اپنی زندگی کی شام کے

قریب جلا یا ہے۔ اُسے جلنے دے۔ پروردگار۔ یہ نہ بُجھ جائے۔ روک۔ اس طوفان اس آندھی کو روک۔ یہ آندھی ہے روزِ روشن کو تیرہ و تاریک کرتی ہے۔ اُجالے کو اندھیرا بناتی ہے۔ آلام و افکار کے طوفان مصائب کی آندھی حوادث کے جھونکے۔ بچالے مالک بچالے۔ جلنے دے یہ ٹمٹماتا ہوا دیا جلنے دے۔

ارے رے رے! تیز ہوا کا یہ جھونکا ——— آہ!

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام بابو گوپال داس مینجر چھپی
اور شیخ رشید احمد صاحب نے میسرز تیج رام اینڈ
سنز لاہور کے لیئے شائع کی۔

[illegible] اور کلکتہ آرٹ پریس لاہور میں چھپیں!

محمد حسین کاتب (کوٹلوی)
گلزار ہاؤس۔ نبل روڈ لاہور